ایک کلی دو پتیاں

ایک کلی دو پتیاں

(کہانیاں اور کہانیاں)

جیلانی کامران

التفائن بک سنٹر۔ چوک بل روڈ
لاہور

اشاعت اول . . . . جنوری ۱۹۵۷ء

قیمت . . . . . . دو روپے آٹھ آنے

ناشر :۔ امان عاصم ۔ افغان بک سنٹر ۔ چوک جی روڈ ۔ لاہور

پرنٹر :۔ تعلیمی پریس لاہور ۔

فہرس

انگریزی آنرز کے طالب علموں کے نام ———،

یونیورسٹی، ایڈنبرا

نومبر ۱۹۵۶

چٹان کے اُس طرف

یہ پچھلے سال کی گرمیوں کی چھٹیوں کا ذکر ہے۔ گو اِڈنبرا میں گرمیوں کے دن ذرا کم آتے ہیں پھر بھی پچھلے سال کا موسم گرما استوائی مزاج کا موسم تھا۔ ہر روز نیلا آسمان، ہر روز چمکتا ہوا سورج اور ہر روز باغوں میں لیٹی ہوئی خوبصورت لڑکیاں۔ مجھے یاد ہے ان دنوں شرما کسی کوئلے کی کان میں کام کرتا تھا۔ اُسے ہفتے کے پچیس پونڈ مل جاتے تھے۔ اور اتوار منانے کے لئے وہ اِڈنبرا آجاتا تھا۔ شاید اُسی نے کہا تھا کہ اس کی گرل فرینڈ دھوپ میں لیٹ لیٹ کر بیمار پڑ گئی تھی۔ اور تمازتِ آفتاب سے اس کی نازک پیٹھ پر آبلے پڑ گئے تھے۔ آپ کو میری بات کا یقین نہ آئے گا مگر آپ مجھ پر اعتماد کریں کہ سبز باغوں میں سفید جسم کی لڑکیاں رنگ برنگ کپڑوں میں بڑی پیاری لگتی ہیں۔ ان کا منہ پیارا ہوتا ہے۔ ہونٹ پیارے ہوتے ہیں سب کچھ پیارا ہوتا ہے۔ مگر پچھلے سال میرے جگر کا فعل خراب ہو گیا تھا۔ اور مجھے کچھ بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ چپ چاپ کمرے میں بیٹھ کر گرم سورج کو دیکھتا۔ اور پھر سگرٹ پینے لگتا۔ سگرٹ پی پی

کہ گلا خراب ہو گیا تھا۔ اور ایک عجیب بے کسی کا عالم طاری رہتا تھا۔

یہ بے کسی کا عالم دو مرتبہ ٹوٹا۔ ایک بار جب میں ٹرام کے نیچے آنے سے بال بال بچا۔ اور دوسری بار جب حیدرآباد کے ڈاکٹر حسینی سے ملاقات ہوئی۔

علی الصبح اُن سے ملاقات ہوئی۔ وہ غلطی سے ۴۸ پر آئے تھے حالانکہ انہیں ۴۸ گریٹ کوئین اسٹریٹ جانا تھا۔ اور جب آ گئے تو واقفیت ہو گئی۔ اور واقف ہونے کے بعد یہ ہماری ہی قسمت تھی کہ اُن کے آنسو بھی دیکھتے۔ سو وہ باتیں کرتے ہوئے رونے لگے کیونکہ ان کی بیوی بھاگ گئی تھی۔

جب کسی کا باپ مر جاتا ہے تو رونے کی صورت اور ہوتی ہے۔ ماں مر جاتی ہے تو حالت اور بھی جدا ہوتی ہے۔ اور اگر خوش قسمتی سے جس کا اُدھار دینا ہو وہ مر جائے تو رونے کی بات ہی پیدا نہیں ہوتی۔ مگر جب بیوی مرتی ہے تو نہ صرف بیوی مرتی ہے سارا جہان مر جاتا ہے۔ ستارے مر جاتے ہیں بہار کا چاند مر جاتا ہے اور تنہائیوں کے گرہن چھا جاتے ہیں —— مگر ان کی بیوی فوت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بدستور زندہ تھی۔ اور ڈاکٹر حسینی رو رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ زندگی کے نام آنسوؤں کی درخواست لکھ رہے ہیں۔ کہ اے زندگی! میرے ستارے مجھے لوٹا دے، میرا چاند واپس کر، میری کنیز فاطمہ کے قدم میری طرف پھیر دے!

جب ان کے آنسو تھمے تو انہوں نے سب سے پہلے زندگی، اس کے بعد انسان، پھر عورت ــــ ان مضامین پر باتیں کیں۔ انہوں نے کہا زندگی کا نام دھوکا ہے، انسان غلطی کا پتلا ہے۔ اور عورت بے وفا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ نئی باتیں نہیں ہیں۔ مگر وہ بھی کوئی شاعر نہ تھے۔ ڈاکٹر تھے۔ اور ایم بی بی ایس میں کئی بار فیل ہوئے تھے۔ امریکہ سے پاس ہو کر آئے تھے۔ اور اب نیوشپ کرنے کا ارادہ تھا۔ امریکہ جانے سے پہلے وہ اپنی کنیز فاطمہ کو حیدرآباد سے بلا کر ــــــــ اپنے پاس ایڈنبرا لائے تھے۔ اور اُسے یہاں رہ کر اپنے مالک کا انتظار کرنا تھا۔ مگر وہ سولہ مہینوں کی لمبی فرقت نہ کاٹ سکی۔ اور کراچی کے کسی خوبصورت توانا اور تنومند ڈاکٹر سے محبت کرنے لگی تھی۔

یہ سب کچھ مسٹر حسینی کے بھاگ جانے کا پس منظر ہے۔

اُنہوں نے ٹیلی فون کیا۔ تو کنیز فاطمہ نے کہا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ وہ جب خود وہاں پہنچے تو کنیز فاطمہ نے کہا کہ وہ ایک آزاد ملک میں ہے۔ اور یہاں پس ماندہ ملکوں کی دھونس نہیں چلے گی۔ جب اُنہوں نے کہا کہ وہ اس کے شوہر ہیں تو وہ کہنے لگی کہ اُسے یاد نہیں ہے۔ غصے میں آ کر اُنہوں نے اُسے ایک روز کا تھپڑ مارا۔ کنیز فاطمہ رونے لگی تو ڈاکٹر حسینی واپس آگئے۔

اور جب وہ پھر ہم سے ملے تو دوبارہ رونے لگے۔ ندامت کے آنسو بہت اثر

رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر حسینی کو دیکھ کر مجھے اپنے صحت مند ہونے کا احساس ہو چلا تھا۔ اور حیرت یہ ہے کہ اس دوران میں میں ہر روز اپنا وزن کرتا تھا۔ اور وزن ہر روز بڑھ رہا تھا۔ مگر جب ان کے آنسو دیکھتا تو اپنی خود غرضی پہ افسوس ہوتا۔ کہ اپنے وطن کا ایک عزیز رو رہا ہے اور میں اپنا وزن بڑھا رہا ہوں۔ خود غرضی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ لہذا میں نے اپنے آپ سے فیصلہ کیا کہ میں اپنے مفید ہونے کا ثبوت دوں گا — اور جہاں بھی وہ گئے میں ساتھ رہا۔

اس دوران میں انہوں نے کئی راتیں باغوں میں جاگ کر گزاریں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں خود تو ان کے ساتھ رت جگے میں شریک نہیں ہوا۔ لیکن گئی رات تک ان کے پاس بیٹھا ضرور رہا ہوں۔ وہ ستارے دیکھتے رہے میں گنتا رہا۔ اور جب وہ آہ بھرنے میں کھانسنے لگتا۔ اور جب وہ میر — تقی میر کا کوئی دردبھرا شعر سناتے تو میں شدت جذبات سے بےچین ہو جاتا۔ غرضیکہ میری حالت بے کسی دور ہو رہی تھی۔ اور مجھ میں زندگی کے آثار رونما ہو رہے تھے — اسی دوران میں انہوں نے ریوالور خریدنے کی کوشش کی۔ یہ خطرناک موڑ تھا "کیا آپ اس سے اپنی پیاری بیوی کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ انہوں نے نہایت غمگین لہجے میں کہا۔

"میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں"

میں نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا "مگر ڈاکٹر صاحب! آپ جانتے ہیں ریوالور کی قیمت کتنی ہوتی ہے۔ کم سے کم بیس پونڈ۔ لائسنس کے لئے دس پونڈ الگ"۔ مگر دقت یہ ہے لائسنس کیسے ملے گا۔ اور فرض بھی کرلیں کہ آپ ریوالور خرید لیں۔ اور خودکشی بھی کرلیں۔ مگر کیا ثبوت ہے کہ خودکشی کرنے کے بعد آپ واقعی مرجائیں گے۔ اور اگر آپ بچ گئے تو دو جرموں میں مقدمہ چلنے کا اندیشہ ہے۔"

بات اُن کے سمجھ میں آگئی۔ اُنہوں نے پوچھا۔

"تو پھر خودکشی کی کیا ترکیب ہوسکتی ہے؟"

"اگر آپ واقعی سنجیدہ ہیں۔ تو میں ایک اصولی بات بتاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ خودکشی کے لئے اہتمام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، اگر آپ مرنا چاہتے ہیں تو کون روک سکتا ہے۔ مگر ریوالور خرید کر مرنا کچھ مناسب نظر نہیں آتا۔ اگر ریوالور کو بڑا کر مرا جائے تو مرنے کی صورت میں ریوالور کا مالک آپ کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔ مگر بات ریوالور کی نہیں اور آپ چوری بھی نہ کرسکیں گے تو ایک کام کریں۔ یونیورسٹی سے پرے ایک پہاڑی ہے۔ اگر آپ اُس پر سے چھلانگ لگادیں تو آپ واقعی مرسکیں گے"

ڈاکٹر حسینی نے نہایت خلوص کے ساتھ اس تجویز کو پسند کیا مگر کہنے لگے۔
"چھلانگ تو واقعی معقول ہے۔ مگر زندگی اور موت کی درمیانی چھلانگ لگانے سے پہلے کوئی آگیا تو؟"
"میں نے مشتاق مرنے والوں کی طرح کہا کہ کوئی نہیں آئے گا۔ آپ صرف مرنے پر تُلے رہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ ——
جب ہم پہاڑی پر پہنچیں گے تو آپ مجھ سے کچھ قدم آگے ہو جائیں۔ میں آپ کو آواز دوں گا "ڈاکٹر صاحب! اس طرف چٹان کچی ہے۔" تو آپ بھاگنا شروع کر دیں۔ میں اور چلاؤں گا۔ آپ اور بھاگیں۔ اور میری طرف دیکھ کر کہیں "میں خودکشی کر دوں گا۔" یہ بات ضروری ہے کیونکہ صرف اسی طرح منہ پھیرنے سے آپ کا پاؤں پھسل سکتا ہے اور آپ واقعی مر سکتے ہیں۔"
"اور جب میں مر گیا تو —— !"
"تو کیا —— ؟" میں نے کہا "میں چٹان پر سے آواز دوں گا۔ حسینی! ڈاکٹر حسینی!"
"اور میں تمہاری آواز نہ سن سکوں گا۔ میں کہیں دور پہنچ چکا ہوں گا۔ سرحدوں سے دور، حیات و موت کی سرحدوں کے پار —— اور کنیز فاطمہ!"
"اس کا آپ فکر نہ کریں۔ جب اُسے معلوم ہو گا کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے تو وہ کالے

کپڑے پہنے گی۔ ۔ ۔ ۔ "

بات کاٹ کر ڈاکٹر حسینی نے کہا

"کالے کپڑے! کنیز فاطمہ سیاہ لباس میں ایسی پیاری لگتی ہے جیسے' جیسے چاند بادلوں میں!"

—— اس وقت گو رات تھی مگر ایڈنبرا کی گرمی کی راتیں ہماری راتوں کی مانند اندھیری نہیں ہوتیں۔ ہلکی ہلکی روشنی رہتی ہے اور جب وہ خودکشی کا سوچ رہے تھے۔ یہی رات کے گیارہ بجے تھے۔

اُنہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کہ اُن کے مرنے کے بعد کنیز فاطمہ بیوہ ہو جائے گی۔ مگر "چاند بادلوں میں" والی ترکیب کچھ ایسی تھی کہ بے اختیار آنسو آ گئے۔ اُنہوں نے جیب سے بٹوا نکالا۔ اور بٹوے میں سے ایک تصویر نکالی۔ اور اُسے دیکھنے لگے' اور ایسے جیسے کہ وہ اُسے اپنے آپ سے کھینچ کر جُدا کر رہے ہوں اُنہوں نے تصویر میری طرف بڑھا دی اور کہا'

"یہ تصویر رکھ لیں۔ میری نشانی رہے گی۔ مرنے کے بعد میں نہیں چاہتا کنیز فاطمہ پر کوئی حرف آئے! اس بٹوے میں پچاس پونڈ ہیں یہ بھی رکھ لیں۔ میرا کفن دفن اب آپ کے ذمے ہے۔ میں اہل سنت ہوں۔ اور حنفی فقہ پر میرا ایمان ہے۔ گو میری موت حرام ہے۔ اس کا مجھے افسوس نہیں ہے۔ زندگی تو ویسے بھی دوزخ

ہے اگلے جہاں میں دوزخ بھی کوئی نئی چیز نہ ہوگا ——" ہر طرف اداسی کا سایہ بکھر رہا تھا"

میں نے نہایت خلوص دل کے ساتھ کہا

"کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوت"

ولایت میں آکر عربی ویسے بھی بھول چکی تھی۔ میں نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا "ہر نفس کے لئے موت کا ذائقہ ہے۔

ڈاکٹر حسینی نے کہا کہ میں سچ کہتا ہوں۔ موت ایک بہت بڑی تبدیلی ہے جو زندگی کو حیات کے تسلسل سے کاٹ دیتی ہے۔ تبدیلی کا نام موت ہے۔

اور ہم دونوں پہاڑی کے پاس پہنچ گئے۔

اس پہاڑی کو سب آرتھر کی نشست گاہ کہتے ہیں۔ پہاڑی کے اردگرد پارک کی سی کیفیت ہے۔ چاروں طرف ایک سڑک کاٹی گئی ہے۔ اور سڑکوں کو آپس میں ملانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہیں۔ بنچیں ہیں جن پر سیر کرتے ہوئے لوگ بیٹھتے ہیں اور کبھی کبھی غروب آفتاب کا مزا لیتے ہیں مگر اکثر اُن کا احساسِ جمال انسانی جسموں کی لطافت سے منسوب ہوتا ہے۔ اس وقت صرف ایک بنچ پر ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھے۔ دونوں سگرٹ پی رہے تھے۔ اور خموش تھے۔ آسمان نیلا تھا

ایڈنبرا کا منظر بہت دل آویز تھا۔ یونیورسٹی کا گنبد، کارخانوں کی چمنیاں، گرجاؤں کے مینار، جھیلوں کا پانی، فاصلے پر سمندر، اور پرانے بادشاہوں کا محل، سب خوبصورت تھے،

مگر ہمیں خوبصورتی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہم موت کی راہوں پر گامزن تھے۔ جو قدم بڑھاتا تھا زندگی سے دور جا رہا تھا۔ ہر قدم کی حقیقت ابدی تھی۔ لمحوں کا نام بقا ہے! اور ڈاکٹر حسینی زمین کی طرف دیکھتے تھے۔ زمین اُن کے پاؤں تلے یوں گذر رہی تھی جیسے ان سے کہہ رہی ہو "الوداع! اے زندگی کے آخری مسافر، رخصت!" مگر زمین سے کہیں میری ذمہ داری زیادہ تھی۔ میں ڈاکٹر حسینی کے سفرِ زندگی کا آخری ساتھی تھا۔ جو اصل میں کنیز فاطمہ کو ہونا چاہیے تھا۔ اور جب کہ ہم موت کی گھاٹیوں اور زندگی کی بلندیوں تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے ڈاکٹر حسینی سے کہا۔

"خدا حافظ!"

"خدا حافظ" اُنہوں نے آہستگی سے کہا۔

میں نے سگرٹ سلگایا۔ اور ڈاکٹر حسینی سے کہا کہ وہ سیر کے بہانے پرے کی چٹانوں کی طرف جائیں تو میں پہلی آواز دوں گا۔ وہ آہستہ آہستہ دُور ہونے

گئے۔ اور میں سگرٹ پیتا رہا۔ سگرٹ کا دھواں ہلکا، نیلے آنچل کی مانند لطیف تھا؛ ہوا میں خنکی تھی۔ اور زندگی کا احساس جاں بخش تھا۔ ڈاکٹر حسینی چٹانوں کے پرے ہوتے گئے۔ زندگی سے دور ہوتا ہوا انسان، فنا کے راستوں پر جاتا ہوا اُداس راہی، ڈاکٹر حسینی مرحوم!

اس موقع پر مجھے آواز دینا تھی۔ قریب سے ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا آپ دیا سلائی دے سکتے ہیں؟"

سگرٹ پینے والے ایک دوسرے کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے گنہگار گنہگار کو پہچان لیتا ہے۔

ماچس واپس لینے کے بعد جب میں نے چٹانوں کی طرف دیکھا ڈاکٹر حسینی دکھائی نہ دیتے تھے۔ "فنا سب کے لیئے ہے" میں نے غلط عربی میں دہرایا۔ حالانکہ مجھے وفات سے متعلق آیت پڑھنی چاہیئے تھی۔ مگر موقع کی نزاکت ایسی تھی کہ میں مناسب آیتوں پر دھیان نہ دے سکا۔

جب میں ڈرتا ڈرتا چٹانوں تک پہنچا کہ کہیں میں خود ڈاکٹر حسینی کا ہم سفر نہ بن جاؤں تو دیکھا کہ ڈاکٹر حسینی، ایک واقعی خطرناک چٹان پر بیٹھے ہیں۔ بہت نیچے بجلی کا کھمبا میرے قد کے برابر دکھائی دیتا تھا۔ اور آپ جانتے ہیں میرا قد کتنا ہے! میں

نے چلا کر کہا۔

"ڈاکٹر حسینی! واپس آجائیے، وہ چٹان خطرناک ہے"

میں نے اپنے تئیں یہ کہا تھا کہ جب وہ پہلی آواز سے اور دور جائیں گے تو میں دوسری آواز آہستہ دوں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں چاہتا تھا کہ وہ واقعی مر جائیں۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ پستول سے مرنے کی بجائے جوانمردی کی موت بہتر ہے" اور بلندی سے گر کر مرنا کتنا خوبصورت ہے۔ جیسے آسمانوں سے فرشتہ نازل ہو رہا ہو۔ مگر میری پہلی ہی آواز سے صورتِ حال بدل گئی۔

ڈاکٹر حسینی واپس آگئے!

وہ خوش واپس آئے۔ میں خوش ہو گیا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اگلی دنیا سے واپس آئے ہوں۔ اُن کی چال میں ایک امتیاز تھا۔ اب ان کا قد لمبا دکھائی دیتا تھا۔ وہ عجیب نورانی دکھائی دیتے تھے۔ ان کی نگاہیں سامنے دیکھ رہی تھیں اور ان کے ہاتھ بالکل سیدھے نیچے لٹکے ہوئے، منظر کی خوبصورتی لمحوں میں بدل گئی تھی۔ اُنہوں نے فوراً رک کر کہا،

"الحمدللہ"

میں چونک اٹھا "الحمدللہ" یہ عربی باتیں کرنے کا کون سا وقت ہے؟"

"میں صرف خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ اُس نے مجھے ہلاکت سے بچا لیا"
"عجیب بات ہے" اس میں خدا کا شکر ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خدا نے تو آپ سے
کہا نہیں تھا کہ آپ خودکشی کریں وہ تو ساری ذمہ داری کنیز فاطمہ کی ہے۔
"سب درست ہے" ڈاکٹر حسینی نے کہا "مگر لمحوں سے یہ ابدیت پیدا ہوتی ہے۔ اُدھر
بھی میں نے چٹان پر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں گر رہا ہوں۔ ایک گرتا ہوا جسم، ہوا
میرے دامن سے کھیل رہی ہے۔ میں زمین اور آسمان کے درمیان راستہ طے
کر رہا ہوں۔ اور پھر زمین میرے قریب آ گئی۔ دفعتاً اور میری آنکھوں کے سامنے
ایک ہمیشگی پھیل گئی۔ ایک عجیب دنیا جہاں بنفشے کے پھول کھلتے ہیں۔ اور معصوم کنواریاں
خلوت میں دف بجاتی ہیں۔ ان کنواریوں کے درمیان میری حسین کنیز فاطمہ تھی۔ اُس
نے گلاب کے پھولوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے کئی کلیاں میری طرف پھینکیں
اور ایک کلی پھینکتے وقت کہا "یہ میرا دل ہے"۔ اور جب میں اُس ہمیشگی کی دنیا سے پلٹا تو
مجھے محسوس ہوا کہ جسم کی خواہشیں عارضی ہیں۔ اصل خواہش روح کی خواہش ہے۔
محبت روح پر عبور رکھتی ہے۔"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا
"میں نہیں جانتا محبت روح پر عبور رکھتی ہے یا جسم پر عبور رکھتی ہے۔ آپ نے جو کرنا ہے

خوشی سے کریں۔ میں زیادہ دیر رک نہیں سکتا۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

ڈاکٹر حسینی نے کہا

"اے میری زندگی کے آخری ہمراہی! میں جس چٹان پر بیٹھا ہوں وہ زندگی کی چٹان ہے۔ زندگی پختہ ہے۔ اور ہر وہ چیز جو ناپختہ ہے موت ہے۔ اسی طرح محبت بھی پختہ ہوتی ہے۔ اور اسی طرح انسان بھی ناپختہ ہوتا ہے۔"

اب میرے لئے عین مناسب تھا کہ میں خودکشی کرتا۔

مگر ـــ ڈاکٹر حسینی بیٹھ گئے یا وہ نورانی صورت بیٹھ گئی، میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خواہ مخواہ مفید بننے کی کوشش میں ایسا ہونا غیر اغلب نہ تھا۔

"ڈاکٹر حسینی! میں فلسفے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں۔ اور مجھے اب آپ سے ڈر آتا ہے۔ آپ جیتے ہیں یا واقعی مر چکے ہیں۔ صاف صاف کہیئے۔"

اور میں نے سگرٹ سلگایا۔ سگرٹ والے سگرٹوں کو اس لئے بھی پیتے ہیں کہ ان کا خیال ہے سگرٹ ان کا ساتھی ہوتا ہے۔ اور مجھے کسی ساتھی کی خواہش اس موقعے سے زیادہ کبھی نہیں ہوئی۔

"میں زندہ بھی ہوں اور مر بھی چکا ہوں۔ میرا حال اُس ستارے کی مانند ہے جو رات کے وقت چمکتا ہے گردن کا ستارہ کہلاتا ہے۔ مگر ۱۸۹۹ میں ایسی بات نہ تھی!"

"آجکل ۱۹۵۵ ہے ۱۸۹۹ تو بہت دیر کی چیز ہے - بہت بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں آپ"

"عقل کی باتیں عموماً دیوانگی کی باتیں ہوتی ہیں - ان دنوں میں بھی جوان تھا - اور ان سیڑھیوں پہ ہر شام گذرا کرتا تھا - ۱۸۹۹ میں گھوڑے گاڑیوں کا رواج تھا - میں میڈیسن کا طالب علم تھا - اور دن رات ڈاکٹری سے میرا سروکار تھا - یہ دور گذرے نصف صدی گذر چکی ہے - وہ زمانے جا چکے ہیں جب وقت کا رنگ گلابی تھا - مجھے وائیلن سے نفرت تھی - مجھے عورت سے نفرت تھی، مجھے ہر شے سے نفرت تھی - مگر دوائیں اور بیماریاں —— ان سے میرا لگاؤ تھا - اور ان کے علاوہ مجھے بابو پریم سندر رائے سے لگاؤ تھا!"

اس وقت میرے لئے ضروری ہے کہ میں آپ سے کہوں کہ میں جھوٹ کہہ رہا ہوں، یہ سب کچھ جھوٹ ہے - مگر اس وقت مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر حسینی میں ضرور کوئی تغیر رونما ہوا ہے - اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ انہوں نے جو کوٹ پہنا ہوا تھا اس کے کالر میں سرخ گلاب کی ایک کلی ٹکی تھی - اور خوشبو کا خوشگوار بوجھ ہوا میں اُڑ رہا تھا -

"پریم سندر کلکتے سے تھا - میری طرح ڈاکٹری کا طالب علم تھا مگر اسے مردہ جسموں کی

بجائے زندہ جسموں سے دلچسپی تھی۔ وہ حُسن کو بوسوں میں تلاش کرنے کا شوقین تھا۔ اور اسی تلاش کے باعث اُس کے جوتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کپڑے بے شمار تھے۔ اور لیونڈر کی شیشیاں ان گنت تھیں۔ اُس کا ناچ دلفریب تھا"
ڈاکٹر حسینی کہتے گئے۔ رک رک کر، اور ایک غیر مانوس لہجے کے ساتھ!
"بوسوں سے جسم قریب آتے ہیں۔ اور جسموں کی قربت کا نام محبت ہے۔ جن دنوں پریم سندر محبت کرتا تھا۔ اُس کی طبیعت سُندر بن میں اُگے ہوئے گلباسی کے پھول کی طرح زرخیز تھی۔ وہ وائلن بجاتا تھا۔ اور اُس کا مرغوب گیت ہمیشہ یہی تھا" مجھے پھر نہ کہو من موہن!"۔

"گیت اچھا معلوم ہوتا ہے" ہم نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا
"مگر بات یہ ہے کہ من موہن کیوں نہ کہو؟ کیا اس لئے کہ سب محبتیں خون سے پیدا ہوتی ہیں، کیا انسان بڑھاپے میں بھی اُسی طرح پیار کر سکتا ہے جیسے جوانی کے دنوں میں؟ اور اگر محبت خون سے پیدا ہوتی ہے تو مرنے کے بعد اس کا کیا حشر ہوتا ہے؟ موت اور محبت میں کیا تعلق ہے۔ کیا محبت اور زندگی ایک ہی چیز کے نام ہیں؟"
میں آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ ڈاکٹر حسینی نے کبھی شعر و فلسفہ پہ گفتگو نہ کی تھی۔

دیکھنے میں وہ مریض دکھائی دیتے تھے۔ اور اُن کے سینے کی ہڈیاں گنی جا سکتی تھیں۔ اور جب میں نے اُنہیں بنیان پہنے ہوئے دیکھا تھا میں مسز حسینی کے بھاگ جانے پر بہت خوش ہوا تھا۔

"اور جیسا عموماً ہوتا ہے اُس کی ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ مسکراہٹیں۔ محبتیں، وعدے، سب منزلیں خواب کی طرح گذریں، چاند اور ستاروں نے مل کر گیت گائے۔ اور جب اس خوبصورت دنیا میں دن طلوع ہوا —— پریم سندر عیاں ہو چکا تھا۔ اور اُس کی محبت شادی کی محبت بن چکی تھی —— مگر ان سے کہیں زیادہ اہم واقعہ یہ ہوا کہ اُس کا باپ اُس سے ناراض ہو گیا۔ اور روپے آنے بند ہو گئے۔ محبت پہ انسان جی نہیں سکتا۔ ساری زندگی تو روپے پر قائم ہے۔"

ڈاکٹر حسینی کے اس فقرے نے مجھے چونکا دیا۔ گو مجھے روپے کی اہمیت سے انکار نہیں ہے تاہم محبت کی توہین اور روپے کی تعریف سے میرا دل بُرا ہوتا ہے۔ میں پیدائشی سوشلسٹ ہوں۔ اور میری نظر میں محبت اور سوشلزم ایک سے حسین ہیں، میں نے کہا۔ "محبت آنسوؤں سے پیدا ہوتی ہے مگر روپیہ پسینے سے پیدا ہوتا ہے۔ پسینہ سے بدبو آتی ہے مگر آنسو کتنے پیارے ہیں۔ نمکین آنسو، جیسے زمین کا نمک!"

مگر ڈاکٹر حسینی کہتے گئے۔

"پریم سندر کی سب چیزیں بکنے لگیں۔ وہ میرے قریب رہتا تھا۔ اب دُور جا چکا تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ' اُس نے کئی مکان بدلے۔ کم سے کم تر کرائے کی خاطر۔ اور جوں جوں روپے کی دھار پتلی ہوتی گئی وہ اُسی طرح نیچے نیچے گرتا گیا۔ تیسری منزل سے پہلی منزل تک' اور پہلی سے تہ خانوں میں! اور پھر میری اُس کی ملاقات نہ ہوئی' وقت پر غریبی کے پردے تھے۔ اور غریبی سب محبتوں کی پردہ پوش ہے!"

"کیا آپ پریم سندر سے کبھی ملے بھی؟"

"اُس وقت وہ پُرانے شہر میں کہیں رہتا تھا۔ اُداس ٹھنڈے اور بھیانک تہ خانے میں! سردیوں میں سرد ترین کمرہ' دھوئیں کا ہاتھ کمرے میں تیرتا تھا۔ ایک کونے میں اُس کی بیمار بیوی تھی۔ اُسے دِق ہو چکی تھی۔ ایک مریض بچہ چولھے کے پاس لیٹا ہوا تھا۔ پریم سندر نے مسکرا کر کہا "کمرے میں اتنی سردی تو نہیں ہے"——

وہ اداس ضرور تھا مگر مایوس نہیں تھا۔ غریبی اور بیماریاں اُس کے دامن سے دھوئیں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں مگر وہ اپنی بیوی سے اُسی طرح خوش تھا۔ وہ اُس کے ساتھ اُسی طرح مسرور تھی۔ مگر بچہ بیمار تھا۔ ماضی' حال اور مستقبل سب کا بوجھ اُس بیمار بچے پر پھیل رہا تھا۔ کھانسی اُس کی پسلیوں میں گھس چکی تھی!—— میں نے

اُس سے پوچھا"

"پریم سندر دن کیسے ہیں ؟"

"دوست ! گذر رہی ہے ۔ تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوں، مگر میری بیوی میری ہے ۔ مجت میری ہے ۔ اور میرا وائلین میرا ہے ۔ اسے بگاڑا نہیں گیا ۔ یہ میری آتما ہے !"

میرے جانے سے پہلے پریم سندر نے کہا" یہ وائلین اسی طرح چیختا ہے ۔ اس کی پکار رہی ہے" موہے پھر نہ کہو من موہن !" اور وائلین چیخنے لگا ۔ جیسے جمی ہوئی برف پر ٹین کی چادر چیختی ہے !

ڈاکٹر حسینی خوش ہو گئے ۔ میں بھی خوش تھا ۔ دفعتاً اُنہوں نے چٹان کی طرف دیکھا اور اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ وہی انداز، اُسی طرح کی امتیازی خصوصیت ۔ اور چٹان کی طرف جانے لگے ۔

میں چلایا " ڈاکٹر حسینی ! حسینی !"

آرتھر کی نشست گاہ پر میری آواز ایسے گونجی جیسے میں خودکشی کرنے سے پہلے زندگی کو آواز دے رہا ہوں !

وہ بڑھتے گئے ۔ ایک سایہ دُور ہوتا گیا ۔ میں بھاگنے لگا ۔ اور ڈاکٹر حسینی کو پکڑ

لبنیٰ:

"خدا کے لیے ڈاکٹر خدا کے لیئے واپس آجایئے!"

—— واپس آنے کے بعد جب میں نے ڈاکٹر حسین کے کالر میں سرخ کلی کو چھوا۔ وہ نقلی گلاب کی کلی تھی۔ کپڑے کی بنی ہوئی کلی۔ مگر اُس کی خوشبو گلاب سے زیادہ لطیف تھی۔

نیا آدمی

اگر آپ نے بلبل کو دم توڑتے ہوئے دیکھا ہے تو آپ نے اس کی زخمی آنکھوں کو بھی دیکھا ہوگا۔ جب میں اُسے دیکھتا تھا مجھے زخمی بلبلوں کی یاد آجاتی تھی جو بہار کے دنوں میں گیت گاتی ہیں۔ اور جب پھولوں کے دن چلے جاتے ہیں وہ کانٹوں سے اپنا دل چھیر لیتی ہیں۔ ان باتوں سے اگر آپ مجھے شاعر سمجھ لیں تو درست نہ ہوگا۔ میں آپ ہی کی طرح کا آدمی ہوں۔ مجھ میں اور آپ میں صرف یہ فرق ہے کہ جب میں اُسے دیکھتا تھا مجھے وہ بلبل دکھائی دیتی تھی۔ مگر ایسی باتوں سے کیا فائدہ! اُن دنوں جب وہ کہا کرتی تھی کہ وہ محبت کی مانند طاقت ور ہے میں اُسے اپنے بازوؤں میں چھپا لیتا تھا کیونکہ مرد طاقت ہے اور عورت محبت کا نام ہے اور جب وہ خوش ہو کر ان زخمی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی تو میں نہ صرف دل کے پھول بکھیر دیتا بلکہ اُسے اپنی آغوش میں بھی بھینچ لیتا تھا۔

مگر یہ سب کچھ اُن دنوں کی یاد ہے جب وہ میری بیوی نہ تھی!

پھر سب کچھ بہت تیزی سے ہُوا۔ گذرا اور ایک سخت دل واقعہ بن گیا۔ میں نے وہی کیا جو سب لوگ کرتے ہیں۔ مگر سب لوگ حالات کو کسی اور طرح دیکھتے ہیں میں کسی اور طرح دیکھتا تھا۔ جس صبح میں نے اُسے اپنی بیوی بنانا تھا میں رات بھر روتا رہا جیسے لوگ گذرتے ہوئے دنوں کا ماتم کرتے ہیں۔ اور جب میں اُسے اپنی دلہن بنی دیکھ رہا تھا مجھے ایسے لگا جیسے اُس کے ہونٹوں پر بوسے دینے والا کوئی اور شخص تھا۔ وہ کسی اور کی بیوی تھی۔ وہ میری دلہن نہ تھی کسی اور کی دلہن تھی شادی کی رات میں نے اُسے کسی کی بیوی سمجھ کر پیار کیا۔ اور وہ مجھے اُنہیں آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ زخمی بلبل کی سیاہ آنکھیں!

اُن دنوں دریاؤں میں سیلاب آیا ہُوا تھا۔ اور ریل کی پٹڑی اور موٹر کی سڑکیں سب زیرِ آب تھیں۔ مگر پانی کے طوفانوں کا مجھے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ہمیں کئی ایک جگہ پانی سے گزرنا پڑا۔ مگر میں اُسے اس احتیاط سے پانی میں سے لئے جا رہا تھا جیسے وہ کہانیوں کی شہزادی ہو اور میں سفر طے کرنے والا وزیر زادہ! ایک دفعہ پانی میں گرتے وقت اُس نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور میں نے اُسے تیز بہتے ہوئے پانی کے درمیان چوم لیا۔ اس کی آنکھیں جذبات سے

طوفان انگیز ہوگئیں ۔۔۔ میں نے سمجھا کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ پھول مرجھا جائیں گے نہ آسمانوں کا آفتاب رہے گا اور نہ صبح کے ستارے، مگر میری محبت ہمیشہ روشن رہے گی۔ وہ میرا دل ہے اور جب تک دل دھڑکتا رہے گا میں بھی زندہ رہوں گا۔

مگر یہ سب کچھ اُس وقت ہوا جب میں طوفانی پانیوں کے درمیان کھڑا تھا اور وہ بھیگی ہوئی شاخ کی مانند مجھ سے لگ کر کھڑی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میری سمجھ کے باہر ہے۔

مجھے ریت کے میدانوں سے گذر کر بہت دور کسی شہر میں جانا تھا۔ اور راستے میں ایک بڑا دریا پڑتا تھا۔ برسات کے دنوں میں اُس کا پاٹ بڑھ جاتا تھا۔ اور اُسے عبور کرنے کے لئے جہاز کی ضرورت پڑتی تھی۔ ہم دونوں بہت دیر تک اس کنارے پر بیٹھے آنے والے جہاز کا انتظار کرتے رہے۔ دھوپ تیز تھی اور ہم سرکنڈوں کی آڑ میں بیٹھے۔ میں نے اُسے کہا تمہاری آنکھیں بڑی پیاری ہیں۔ عمّان کے سمندروں میں موتی بہت خوبصورت ہیں مگر تمہاری آنکھیں خوش منظر ہیں۔ اُس نے مسکرا کر اپنی گردن میری گود میں رکھ دی۔ میں نے اُس کے بھورے بالوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا کاش کہ میں زندگی کے سارے برس تم پر لٹا سکتا۔ وہ دن جو تم سے ملے بغیر

گذرے ہیں روشنی کے بغیر ہیں۔ تم میری روشنی ہو!

جہاز ابھی تک نہیں آیا تھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ یہ دریا بہت پرانا ہے۔ برفانی پہاڑوں سے آتا ہے جہاں کونجیں رہتی ہیں، اور اپنی لمبی لمبی گردنوں کے ساتھ جنگلی گلاب کے پھولوں کے ساتھ پیار کرتی ہیں۔ پانی چٹانوں سے رستا ہے جیسے جوان کنواریوں کی رگوں میں دلہن بننے کی خواہش سرسراتی ہے۔

پھر میں نے اُسے کہا

اس دریا کے کنارے بادشاہ اور راہگیر آئے، آئے اور وقت کی گہری زنجیر کو اٹھائے گذر گئے۔ اور آج بعد دوپہر ہم دونوں ان پانیوں کے کنارے ان گذرے ہوئے دنوں کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔

میں نے اُسے پیار سے کہا "زندگی"

وہ زخمی بلبل میری گود میں خاموش چھپی رہی۔ اور اس کی لمبی پلکیں میرے ہاتھوں کو چومتی رہیں۔

جہاز آگیا۔ میں اُسے لئے جہاز پہ سوار ہو گیا۔ جہاز نے وسل دیا۔ اور دور سے کھجور کے درختوں نے کہا

"مسافر لوٹ کے آ۔ ہماری گودیاں تیرے لئے بے قرار ہیں"

اُس وقت میں نے محسوس کیا وہ میری بیوی نہیں ہے اور نہ ہی میری محبوب ہے وہ کسی اور کی بیوی ہے میں نے اپنے آپ سے کہا کہ دریا گہرا ہے۔ اور جو شخص گم جائے وہ بچ نہیں سکتا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں اُسے اوپر کی چھت سے دھکا دے دوں گا۔

میں نے اُسے کمرے کے پاس جاکر آواز دی۔ اور جالیوں کے دوسری طرف باریک باریک ہونٹ میری آواز سن کر مسکرائے جیسے پردیس میں رہنے والی عورتیں خواب میں ہنس پڑتی ہیں۔

وہ میری آواز پر ایسے چلی آئی جیسے بوسے کی طرف ہونٹ!

میں اُسے اوپر کی چھت پہ لے گیا۔ جہاں سے جہاز کے پہیے پانی سے بنرد آزما ہوتے نظر آتے ہیں۔ لوگ جہاز کے دوسری طرف باتیں کر رہے تھے۔ اور شام کا ہلکا دھندلکا پھیل رہا تھا۔

اُس نے کہا

جیسے پانی کی موجیں بے قرار ہیں یوں وہ میرے لئے بے قرار ہے۔

میں نے اُسے بہت سی باتیں سنائیں۔ اور وہ میری موجودگی سے مسحور ہوتی گئی۔ اُس

نے کہا کہ زندگی کی آخری شام وہ میری آغوش میں بسر کرے گی۔ خواہ میرے اور اُس کے درمیان منزلوں کی مسافت ہی کیوں نہ ہو۔ وہ مجھ سے دُور نہ رہ سکے گی۔ اور اگر اُسے مجھ سے ملے بغیر موت آگئی تو دوسری صبح میرے قریب جس پھول پر اوس ہوگی وہ اُس کی رخصت کے آنسو ہوں گے۔

میں نے اُسے دھکا دے دیا۔ جہاز کے پہیے گھوم رہے تھے۔ پانی صابن کے جھاگ کی طرح خوبصورت تھا۔ مگر وہ گری نہیں۔ اُس نے قریب کے تختے کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

وہ کہنے لگی پانی دیکھ کر چکر آجاتا ہے۔ اگر وہ مرجاتی تو اُس کی روح ہمیشہ بے چین رہتی۔ اس کا آرام میری محبت سے قائم ہے۔ اس کی جگہ میرے قدموں میں ہے!

میں اُسے نیچے لے آیا۔

میرا پہلا تجربہ ناکام رہا تھا——

ایک رات میں نے خواب دیکھا۔ وہ کسی کی گود میں سوئی ہوئی ہے۔ میں اُس شخص کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ صبح جب میں اُٹھا اُس نے کہا وہ تمام رات میری گود میں سوئی رہی تھی۔

میں نے خواہ مخواہ کسی شخص کا نام لیا۔ اور کہا کیا وہ اُسے جانتی ہے۔

اُس نے کہا وہ اُس کے بھائی کا دوست تھا۔
مجھے بس نام کی ضرورت تھی۔ اور وہ مجھے مل گیا۔ ایک رات جب ہر طرف خموشی تھی۔
میں نے اُس سے پوچھا "کیا رفیق کے بوسے میرے بوسوں سے زیادہ لذیذ تھے؟"
وہ کانپ گئی۔ اُس نے کہا میں ایسی باتیں کیوں کرتا ہوں۔ مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔
"چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔"
مگر وہ کہتی گئی مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔
میں نے چلا کر کہا "گنہگار عورت! جھوٹ بولنے سے گناہ کڑا ہوتا ہے۔ اقرار کرنے سے زندگی بہتر ہوتی ہے" مگر گنہگار عورت انکار کرتی گئی۔ اور میں غصے سے کانپنے لگا۔
میں نے اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ہر طرف خموشی تھی۔ اور نیند نے سب لوگوں پر خواب پھیلا رکھے تھے۔ میں نے اُسے سخت اُنگلیوں سے چھیدتے ہوئے کہا
"تمہارے بدن میں دوسرے لوگوں کی بو آتی ہے۔ تمہاری چھاتیوں پر اوروں کی اُنگلیوں کے نشان ہیں۔ تمہارا پیٹ بدکار عورتوں کی طرح بے عصمت ہے۔"
بدکار عورت رونے لگی۔ اس نے کہا
"میں تمہارا سایہ ہوں۔ میں تمہارے سائے میں اُگی ہوئی بیل ہوں۔ میں نے جو بھی پانی پیا ہے

وہ تمہارے چشموں کی مٹھاس ہے۔ میں نے جس پھل کو چکھا ہے وہ تمہارے درختوں میں اُگتا ہے۔ اور میرا گیت جس اکیلے پن میں گونجا ہے وہ تمہارے پہلو کی شاخ ہے"۔

میں نے اُسے اپنے جسم سے نوچ کر ایسے پھینکا جیسے شہتوت کے درختوں سے دیمک کاٹ دی جاتی ہے وہ فرش پر گر گئی اور اُس کے بھورے باریک بال بکھر گئے۔

میں کونے سے اپنا ورنی فوجی بوٹ اُٹھا لایا۔ بوٹ کے تلے میں موٹی موٹی نئی کیلیں لگی تھیں۔ میں نے اُس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھول دیں۔ اور اُن پر وزنی بوٹ رکھ دیئے۔ اور وزنی بوٹوں پر اپنا وزن گرا دیا۔ اُس کے پتلے۔ نازک اور پیارے پیارے ہاتھ سیمنٹ کے بنے ہوئے فرش پر اہرام بناتے ہوئے مصری غلاموں کی طرح سسک رہے تھے۔ موٹی آنکھوں سے آنسو کا ایک بڑا قطرہ آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔

اُس نے سسکتے ہوئے کہا

"میں خدا کی زمین پر اکیلی ہوں۔ اور خدا کے بعد مجھے تمہارا آسرا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ چکی ہوں۔ اور میری دنیا تمہاری پرستش ہے۔ تم صبح کے طلوع ہوتے ہوئے سورج ہو اور میں سورج سے پھوٹتی ہوئی کرن کیا کرن بے عصمت ہوتی ہے۔ کیا سورج کا دل پتھر کی طرح سخت ہے"؟

میں نے کہا

"میں نہیں جانتا خدا کیا ہے اور تم کون ہو۔ نہ میں سورج ہوں اور نہ تم کرن ہو۔ تمہاری زندگی گنہ ہے اور گنہ کی مزدوری موت ہے" اس موقعہ پہ وہ بلبلوں کی طرح تڑپی اور زخمی بلبلوں کی مانند اُس کی آنکھوں میں دُکھ تیرنے لگا۔

اور مجھے وہ دُور کی رہنے والی دوشیزہ دکھائی دی۔ اور میں نے فرض کر لیا کہ میں کہانیوں میں سفر کرنے والا مسافر ہوں ——

میں اُس کی کالی کالی آنکھوں کو چومنے لگا۔

میں نے اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ وزنی بوٹ کی کیلوں سے اُس کی ہتھیلیاں زخمی ہو گئی تھیں۔ میں نے ان زخموں پر بوسے بکھیر دیئے۔ اُس نے کہا اُس کا جسم دُکھتا ہے۔ میں نے اپنے بازوؤں میں اس کا خوبصورت جسم لپیٹ لیا۔ اور اُس کے بال اُس کی کوندی ہوئی چھاتیوں پر پھیلا دیئے۔

وہ ایک گیت گانے لگی صحراؤں اور ویرانوں کا گیت۔ وہ گیت جو کنواریاں پردیس میں گاتی ہیں۔ اُس نے کہا "میرا محبوب پردیس چلا گیا ہے۔ اب باغوں میں پھول بھی نہیں آتے۔ ندیاں خشک ہیں۔ اور ریت پر گذرتے ہوئے قافلے بھی رُک گئے ہیں —— میں کس سے پتہ لوں؟ اور کس سے کہوں کہ میں محبت کی بیمار ہوں"

اُس نے میری طرف دیکھا

اُس رات وہ میرے پہلو میں ایسے سو رہی تھی جیسے عشق پیچاں کی شاخ دیوار پر سوتی ہے۔

میرا دوسرا تجربہ بھی ناکام رہا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے اُسے دھکے دے کر اپنے گھر کے دروازے سے باہر نکال دیا۔

آدھی رات اور سنسان شہر

وہ ساری رات دروازے کے باہر بیٹھی رہی۔ اور میں سگرٹ پیتا رہا۔

صبح ہوتے وقت اُس نے کہا کہ وہ میری محبت کا واسطہ دیتی ہے۔ وہ میرے سر کی عزت ہے لوگ اُسے دیکھ کر سمجھیں گے کہ میں راستوں پر گرا ہوا کنکر ہوں۔ اُسے میری عزت اپنی چھاتیوں سے زیادہ عزیز ہے جن سے وہ اپنے ہونے والے بچوں کو دودھ پلائے گی۔

میں نے اُسے اندر آنے دیا۔ وہ حاملہ تھی۔

دنوں کے ساتھ اُس کا پیٹ بڑھتا گیا۔ اُس کا چہرہ بدلتا گیا۔ اور اُس کے ہونٹوں کی بشاشت مٹتی گئی۔ میں نے اُس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"بچہ کس کا ہے؟"

اُس نے فخر کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں چلا کر کہا

"تمہارے فخر میں حرام کاری ہے۔ میں دوسروں کے پھینکے ہوئے بیج نہیں دیکھ سکتا۔

جن کھیتوں کی باڑیں اونچی ہیں وہاں ہوائیں بھی اپنے بیج بکھیر دیتی ہیں۔"

اُس نے کہا کہ اُسے اپنی ماں کے ساتھ سونے میں بھی وہ لطف نہیں آیا جو وہ میرے پہلو

میں محسوس کرتی رہی ہے۔ میرا پہلو اُس کے جسم کی آرام گاہ ہے۔

میرا ذہن سنسنانے لگا جیسے ہوائیں مجھے اٹھا کر بلندیوں پر لے جا چکی ہوں۔

"میرا پہلو تمہارے جسم کی آرامگاہ ضرور ہے" میں نے کہا "مگر تمہاری رُوح میری نہیں۔

تمہارے ہونٹ میری آغوش سے پانی پیتے ہیں مگر تمہارا دل کسی اور کی یاد میں کسی اور کا

ذائقہ چکھتا ہے"

وہ کہنے لگی "اگر دل کو کاٹ کر دکھا سکتی تو اُس پر جو بھی نام ہے وہ تمہارا ہے"

میں نے اُس کے مسکراتے ہوئے گالوں پر اپنے ناخن گاڑ دیئے۔

اُس کے پیٹ میں بنتا ہوا بچہ شدت کے ساتھ تڑپا۔ اور میں ڈر گیا

وہ رات میں نے جاگ کر گذاری۔

اور وہ ہونے والی ماں تمام رات روتی رہی!

بچہ پیدا ہوا۔ اور کچھ دیر کے بعد مر گیا

میں بہت خوش ہوا۔ میں نے کہا کہ نہ تو وہ ماں بن سکی ہے اور نہ ہی اُس نے اپنی

چھاتیوں کا دودھ بڑھتا ہے۔ اس کی آرزوئیں اپنی موت مر گئی ہیں۔ میں ایک دوست سے گراموفون مانگ کر لایا ہوا تھا۔ رات کے وقت میں نے خوشیوں کے ریکارڈ بجائے۔ میں بہت خوش تھا کہ وہ شاخ نہ تو شاخ بنی ہے اور نہ ہی کانٹا اُگا سکی ہے۔

وہ مرنے والے بچے کے لئے آنسو بہاتی رہی۔ اور میں ریکارڈ بجاتا رہا۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا۔ اُس کی آواز ایسے درد سے تھی جیسے بچے کے مرے ہوئے دل سے بول رہی ہو۔

اُس نے کہا کہ میں خوشیوں کے گیت نہ گاؤں

میں نے تلخی کے ساتھ جواب دیا "میں خوشیوں کے گیت گاؤں گا کیونکہ تمہارے بچے کی موت میری زندگی کا نشان ہے۔ تم میرا بچہ نہیں میرا دشمن جن رہی تھیں۔ تمہارے تو جیسے میری زندگی کی بجائے میری موت کی پیدائش تھے۔ وہ موت گذر گئی ہے۔ اور میں خوش ہوں! اب تمہاری چھاتیوں کا دودھ بے کار ہو گا۔ یہ دودھ سے تنی ہوئی چھاتیاں، اُن خوبانیوں کی طرح مرجھا جائیں گی جنہیں توڑنے والے ہاتھ نوچ لیتے ہیں۔ تمہاری چھاتیوں کی نوکیلی اُٹھان جس خلش کو محسوس کرے گی وہ خلش کبھی دور نہ ہو گی۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کے بیمار پیٹ پر سے چادر ہٹا دی۔ سلوٹوں والا پیٹ جھانکنے لگا۔

"ان سلوٹوں کی زندگی مر چکی ہے۔ تم جس کے انتظار میں مہینوں بے چین تھیں وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔"

نجانے اُسے کیا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اُس نے سرہانے سے بچے کا سلا ہوا کرتا نکالا۔ اور اُسے چومنے لگی۔

وہ پیدا ہونے والے بچے اور مرنے والی ماں کا سنگم تھی!

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں چھوٹے صندوق سے بچے کے سب کپڑے نکال لایا۔ اس کے ہاتھوں سے سلا ہوا کرتا چھین لیا اور انہیں آتشدان میں پھینک کر آگ لگا دی۔

وہ ایک تیز چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو گئی۔

میں نے اُسے پانی کے چھینٹے دئے۔ اور پیار سے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیریں۔ اُس کا نام لے کر پکارا۔ وہ ہوش میں آ گئی۔ اُس نے میری طرف زخمی بلبلوں کی مانند دیکھا۔ اور کہنے لگی کہ پیدا ہونے والی اور آنے والی زندگی میں ہوں۔ وہ میرے جسم پر ٹوٹی ہوئی شاخ ہے۔ اور میں اُس شاخ کا خوبصورت پھول ہوں۔ جیسے

خوش رنگ پتیوں میں خوشبو رہتی ہے وہ میرے جسم کی حسرت ناک انگڑائی ہے۔

اُس نے اپنا تھکا ہوا سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا جہاں میرا دل دھڑکتا ہے۔ اور کہنے لگی۔

"میری خواہش اس دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے"

اُس رات وہ نیند میں باتیں کرتی رہی۔ اُس نے کہا میں اُس پر چھایا ہوا پھل دار درخت ہوں۔ اور وہ زمین کی زرخیزی ہے۔ اور جیسے زمین کی زرخیزی پھل دار درختوں میں سمو جاتی ہے اُسی طرح وہ مجھ میں سمو چکی ہے۔

میں نے اُس کا سر پرے کھینچ دیا۔ وہ پائے کے ساتھ ٹکرایا۔ اور وہ ایک آہ کے ساتھ جاگ اُٹھی۔

"نیند بھی میرا ساتھ چھوڑ چکی ہے" اُس نے کہا

یہ کہہ کر اُس نے اُداس آنکھیں کھول دیں۔ اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ دفعتاً اُس نے پوچھا۔

"خدا کہاں رہتا ہے؟"

میں نے بے رُخی کے ساتھ کہا "مجھے معلوم نہیں"

مگر وہ آہستہ آہستہ بولتی گئی "میرا بچہ خدا کے پاس ہے۔ خدا اُسے دیکھ کر بہت

خوش ہوا ہے۔ خدا نے اُسے پوچھا وہ اتنی جلدی کیوں لوٹ آیا ہے تو میرے بچے نے جواب دیا "اُسے زمین پسند نہیں آئی" خدا نے کہا اور بھی تو بہت سے لوگ ہیں جنہیں زمین پسند نہیں آتی۔ مگر وہ اتنی جلد لوٹ کر نہیں آتے
میرے بچے نے کہا "میری ماں بیمار ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ وہ صبح شام روتی ہے۔ اُس کے آنسو کون پونچھے گا؟" خدا کہنے لگا "تمہاری ماں کے آنسو پونچھنے والے مر چکے ہیں۔ اور میں بھی اُس کے آنسو نہیں پونچھ سکتا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ میرا دل زخموں سے بے حال ہے مگر میں زمین سے بہت دُور ہوں۔ اور زمین کے مالک دوسرے لوگ ہیں۔" میرے بچے نے کہا کہ اُسے اپنی ماں سے بچھڑ کر ڈر لگتا ہے۔ یہ سُن کر خدا نے اُسے بانسری پر گایا ہوا نغمہ سننے کو دیا۔ ایک غمگین نغمہ — اور جب میرے بچے نے اُس نغمے کو بجایا خدا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے ..."

وہ خاموش ہو گئی۔ اور خموشی میں اُس کے آنسو بہنے لگے۔
پھر وہ ایک غمگین گیت گنگنانے لگی۔ رُک رُک کر، مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی غمگین گیت سُن رہی ہے اور اُسے سُن کر دُہرا رہی ہے۔
اُس نے گنگنایا۔ سب ماؤں کی گودیں ہری ہیں۔ میری گود خالی ہے۔ سب

طرف اُجالے ہیں مگر میں اندھیرے میں بے مراد ہوں ۔ میرا چاند چمکا اور ڈوب گیا مگر میری نوکیلی چھاتیاں برف کی پہاڑیوں کی مانند کنواری ہیں ۔۔ میں پانی میں اپنا عکس دیکھ کر ڈر گئی ۔ میرے عکس میں میرا بچہ دکھائی دیتا ہے ۔ کاش وہ آئے اور میرے دودھ کا سہاگ لوٹا دے . . . . "

میں نے بیمار عورت کے روتے ہوئے مُنہ کو حقارت سے دیکھا ـــــ اور بھاگ کر کمرے سے باہر آ گیا ۔

کمرے کے اندر وہ بدستور روتی رہی ۔

بہت دنوں کے بعد گرمیوں کا چاند نکلا ۔ اور چاندنی نے اپنی تھپکیاں خوابوں میں سُلا دیں ۔

آدھی رات کے قریب میری نیند کھل گئی ۔ اور میں اُس چارپائی کی طرف بڑھا جہاں وہ سو رہی تھی ۔ چاندنی میں وہ مجھے ابرق کا ٹکڑا نظر آئی تھی جیسے دلہن کے دوپٹے پر لگتا ہو ۔

میں نے چاندنی کا انتظار کیا وہ گذر جائے ۔

جب چاندنی گذر گئی ۔ صحن میں اندھیرا اُتر آیا ۔ وہ بھی میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی جیسے خواب یادداشتوں میں اوجھل ہو جاتے ہیں ۔

میں نے اُس کا پاؤں آہستگی سے ہلایا ــــ وہ سوئی رہی

میں چارپائی کے کنارے بیٹھا رہا۔ اور پھر آہستہ آہستہ سرہانے کی طرف بڑھنے لگا۔

میں نے اُس کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔ اور دبے دبے آواز دی۔ وہ سوئی رہی۔

کسی فوری خواہش کے ماتحت میں اپنے ہاتھ اُس کی گردن کی طرف لے جاتا گیا۔ اندھیرے میں خوف کے پنجوں کی طرح بھیانک۔ اور جونہی میں نے اُس کی گردن کو چھوا۔ وہ چیخ مار کر اُٹھ بیٹھی!

میں نے اُسے کہا کہ میں ہوں۔

وہ کانپ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کھوئے ہوئے بچے کی طرح میرے ساتھ لپٹ گئی۔

جو شاخ ہری ہے اُس کا کاٹنا ضروری ہے۔

میں روزانہ رات کو جب سب لوگ سو جاتے اُسے موت کی نیند سلانے کی تجویزیں سوچتا۔ موت کی نیند اطمینان اور ہمیشگی کی نیند ہے۔

میں نے کہا کہ جب وہ موت کی آغوش میں سو جائے گی میں سُرخ گلاب کی کلیاں لاؤں گا۔

دو کلیاں اُس کے پھیکے ہونٹوں کے پاس رکھ کر کہوں گا "یہاں زندگی کا رنگ

سُرخ تھا۔"

اُس کی قبر کے لیے سنگِ مرمر کا کتبہ ہو گا جس کی عبارت یہ ہو گی "میرا دل یہاں مدفون ہے۔ میں رات کو خموشی بن کر اور دن کو اوس کی شکل اُس کا سوگوار ہوں!"

جب وہ موت کے اکیلے میدانوں میں تنہا ہو گی میں غمگین گیت گاؤں گا۔ زندگی کے فانی ہونے کی شکایت کروں گا اور کہوں گا کہ خدا کا ظلم انسان برداشت نہیں کر سکتے۔ خدا کی آنکھیں اندھی ہیں۔

اور جب بھی وہ مجھے یاد آئے گی میں سمجھوں گا خزائیں دُور ہو ئی ہیں اور بہار آ گئی ہے۔

بہاروں کی آمد کے لیے بہاروں کا گلہ گھونٹنا ضروری ہے ——

میں رات کے وقت جب دنیا نیند کا کاجل ڈال لیتی اپنے کمرے میں پھل کاٹنے والا لمبا چاقو نکال لیتا۔ اور اُس کی چمکتی ہوئی دھار پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ فولاد کی چمکتی ہوئی دھار کتنی خوبصورت ہے۔ نوکیلی چھاتیاں نوکیلی نہیں رہتیں۔ مگر فولاد کی چمکتی ہوئی دھار ہمیشہ خوبصورت ہے۔

میں نے سوچا اس خوبصورت دھار کے لیے میری بیوی کے جسم کا کون سا حصہ

مناسب ہے۔ سینہ اور پیٹ دونوں مجھے ناپسند تھے۔ اُس کی کمر میں فولاد کی دھار کی سی شوخی اور باریکی تھی۔ جیسے بادام کی شاخ جس پر پہلی بار پھول کھلے ہوں۔ مجھے اُس کی کمر پسند تھی۔ اُس کی نفسانی آرزوئیں اسی بل کھائی ہوئی کمر پر سوئی رہتی تھیں جیسے جھیلوں کے کنارے سارس سوئے رہتے ہیں۔

اور آخر وہ موقعہ آگیا۔ رات اندھیری تھی۔ بادلوں نے آسمانوں کو ڈھانک رکھا تھا۔

ہم اوپر کی چھت پر تھے۔ میں نے اُسے نیچے آنے کے لئے کہا۔

اندھیرا ہر طرف تھا۔ کمرے سے گذرتے ہوئے میں نے فولاد کی خوبصورت دھار بھی اُٹھالی۔ اور اپنی بیوی کو سینے سے لگا لیا۔

اُس کا دل ہلکے ہلکے گا رہا تھا۔ وہ پتلے پتلے ہونٹوں سے میری پیشانی کا بوسہ لے رہی تھی۔

میرے ہاتھ میں فولاد کی لمبی دھار تھی۔

میں نے ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ اندھیرے میں اُس نے کہا کہ اگر آسمان سے عشرتوں اور مجھ میں چننے کو کہا جائے تو وہ عشرتیں ٹھکرا دے گی!

قریب تھا کہ بل کھائی ہوئی کمر کو فولاد کی تیکھی دھار چوم لیتی۔ بجلی کی روشنی

سے کمرہ جگمگا اُٹھا۔ دوسرے لمحے وہ بے ہوش تھی!

میں نہ تو گلاب کی سرخ کلیاں لا سکا۔ اور نہ ہی میں نے سنگ مرمر پہ خوشنما عبارت لکھی دیکھی —— اُس کی آنکھیں بدستور زخمی بلبلوں کی مانند اُداس ہیں۔ وہ بدستور زندگی کے دُکھ کی طرح غمگین ہے۔ مگر جس طرح کٹی ہوئی شاخ خودبخود زرد ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ بھی خزاؤں کی طرف سفر کر رہی ہے۔ بہار جو سب طرف آتی ہے اُس کی طرف نہیں لوٹتی۔

وہ اکیلے میں روتی ہے۔ اور خدا اُس کی آواز سننے سے قاصر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور مجھے خودکشی کئے مدتیں گزر چکی ہیں!

مرغی کا بچہ

کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ صرف ایک خاص ملک ہی میں وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔ اگر انہیں کسی دوسرے ملک میں منتقل کیا جائے تو مایوسی ہوگی۔ جیسے آم کا درخت ناروے میں نہیں اُگ سکتا۔ اسی طرح بعض واقعات بھی کسی دوسری جگہ رونما نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ پوچھیں کہ ایسا کیوں ہے؟ تو میں صرف یہی کہوں گا کہ آپ بیمار کیوں ہیں حالانکہ آپ صحت مند دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کے کھیتوں میں قحط کیوں اُگتا ہے؟ لاہور کی طوائفیں حاملہ کیوں ہیں؟ آپ کا چونکنا بے معنی ہے۔ کیونکہ آپ اندھے ہیں۔ آپ کے سامنے لوگ خودکشی کرتے ہیں مگر آپ کی آنکھیں بند رہتی ہیں۔ لڑکیاں کنواری مر جاتی ہیں کیونکہ آپ بے روزگار ہیں۔ اس لئے آپ بے معنی ہیں اور آپ کی پیدائش بے معنی ہے ——— مگر آپ

مجھ سے ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے ؟ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں میاں چنوں میں کاٹن انسپکٹر تھا۔

اگر آپ کاٹن انسپکٹری کی بات پوچھنا چاہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ کاٹن انسپکٹری بڑے کام کی چیز ہے۔ لحاف وغیرہ مفت بن جاتے ہیں۔ اور روپے کی قطعاً کوئی کمی نہیں ہوتی۔ روپیہ پاکستان کے سیلابوں کی مانند عام ہوتا ہے۔ آتا ہے تو آتا ہی جاتا ہے۔ سیلاب بھی تو رُک جاتے ہیں مگر روئی کے کاروبار سے پیدا ہوتا ہوا روپیہ زندگی کی مانند مسلسل ہے۔ زندگی جاودان ہے۔ روپیہ جاودان ہے۔ کاٹن انسپکٹری جاودان ہے۔

میں جس واقعے کا ذکر کر رہا ہوں یا ابھی کروں گا بہت معمولی واقعہ ہے۔ ایسے واقعات روزانہ ہوتے ہیں۔ پلیٹ فارموں پر، گلیوں میں، کھیتوں میں اور حکومت کے منحوس دفتروں میں جہاں آدمی کا غذ پہ سہما ہوا صفر ہوتا ہے۔ میں کوئی مفکر نہیں ہوں ہمارے ملک میں صرف ایک مفکر پیدا ہوا ہے جو آئندہ ایک ہزار سال تک کے لئے کافی ہے۔ اور دوسرے جب بھی میں فکر کرتا ہوں تو ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں دوڑنے لگتی ہیں۔ لیکن پھر بھی دماغ کچھ ایسا غیر معمولی ہے کہ اس واقعے پر سوچنے کو مجبور کرتا ہے۔

موسم گرمیوں کا تھا۔ اور ان دنوں میری بیوی مجھ سے ناراض تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اکٹھے رہتے تھے۔ ایک ہی چھت کے نیچے اور کبھی کبھی ایک ہی پلنگ پر۔ ایسا سمجھئے جیسے دو تلواریں ایک نیام میں رہتی ہوں۔ مگر نہ تو دو تلوار ہے اور نہ میں ہی کوئی ایسی چیز ہوں۔ لہٰذا گذر ہو رہی تھی۔ تو اس روز صبح کے ناشتہ پر انڈے نہیں تھے۔ جس رات بیوی سے لڑائی ہوتی ہے اس کی صبح یہ دیس کی طرح نامہربان ہوتی ہے۔ میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اور سوچا کہ اگر میں خود جا کر انڈے لے آؤں تو بیوی خوش ہو جائے گی۔ اور ہنستی ہوئی بیوی بڑی چیز ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ میں جذباتی ہوں تو میری غرض یہ ہے کہ جذبات کا دوسرا نام ہی تو بیوی ہے۔ خیر چھوڑیئے جذباتیات کو۔ بات انڈوں کی ہے۔

میں جس دکان سے انڈے لیا کرتا تھا۔ اس کا ناغہ تھا۔ قریب کی دو ایک دکانوں پر کچھ ایسی افسردگی تھی۔ جیسے مالک دکان کی بیٹی بھاگ گئی ہو۔ لہٰذا میں نے اس نازک صورتِ حال میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور اسی طرح ایک ایسی دکان پر پہنچا جہاں سے میں نے پہلے کبھی انڈے نہ خریدے تھے۔ میں نے چھ انڈے لئے۔ دو اپنے لئے۔ ایک بیوی کے لئے۔ دو بچوں کے لئے اور ایک اپنے چھوٹے بھائی کے لئے جو گورنمنٹ سکول میں آٹھویں کا طالب علم تھا۔ اور اب درجہ دوم کا مجسٹریٹ ہے۔

واپس آیا تو بیوی نے مسکرا کر دیکھا۔ میں بھی مسکرا دیا۔ اور انڈے دکھائے کہ وہ دوبارہ مسکرائی تو میرا جی چاہا کہ اُسے میٹھا آملیٹ بنا کر کھا جاؤں۔ بغیر صبح ناشتے پر ایسی باتیں مشکل ہوتی ہیں اس لیئے جذبات کی چٹائی بنا کر اُن پہ بیٹھ رہا۔ اور بیوی انڈے فرائی کرنے لگی ۔۔۔ چھوٹا بھائی اپنے کمرے میں تھا۔ اور کتابیں درست کرنے کے ساتھ ساتھ میرا پانی کا بھجن گا رہا تھا۔ "شنکر، شنکر کو میں پوچھوں شنکر میرا کہاں ہے! کون بتائے" پاکستان میں میرا پانی کا بھجن! تو یہ اس کی حسن رومانیت تھی۔ اور نوجوان رومان پسند ہوتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ انڈوں اور انڈوں کے فرائی کرنے میں کون سی رومانیت ہے۔ مگر ہوا یوں کہ میری بیوی اچانک رومان پسند ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی سہالی آنکھیں زخمی فاختاؤں کی مانند بے قرار ہونے لگیں۔ جب اُس نے تین انڈے فرائی کر لیئے تو کہنے لگی۔

"جب ہماری شادی ہوئی تھی تو آپ مجھے سارا دن چوما کرتے تھے"

"اور اب کیا کرتا ہوں۔ اب بھی تو میں تمہیں چومنے کے لیئے فرہاد کی طرح جوئے شیر لانے کو تیار ہوں"

"صرف خاص خاص موقعوں پر" اُس نے کہا

"عام موقعے کون سے ہیں"

میری بیوی سنجیدہ ہو گئی۔ "آپ کہتے ہیں محبت نظر نہیں آ سکتی محسوس تو کی جا سکتی ہے۔

مگر آپ کی محبت نہ تو نظر آتی ہے نہ محسوس کی جا سکتی ہے۔ آپ بابو عبدالغنی کو جانتے ہیں، جب بھی وہ دفتر سے آتا ہے۔ سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے۔ اُس کی بیوی کتنی خوش ہوتی ہے۔ اور پرسوں جب اُس کی بیوی نے دروازہ کھولا تو پٹ بند کرتے ہوئے بابو عبدالغنی نے اُسے اپنے سینے سے یوں لگا لیا تھا جیسے وہ چنبیلی کی کلی ہو۔۔ وہ دونوں کتنے خوش تھے۔ میں نے یہ سب کچھ اوپر چھت پر سے دیکھا تھا۔"

"دیکھو، بلقیس (میری بیوی کا نام ہے) تمہاری محبت نفسانی ارادوں اور تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ گو میں کاٹن انسپکٹر ہوں لیکن اس کے ساتھ گریجویٹ بھی ہوں۔ بابو عبدالغنی تو گھوڑا ہے۔ آدمی بوڑھا ہو سکتا ہے گھوڑا بوڑھا نہیں ہو سکتا۔"

میری بیوی کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آ گئے جیسے ادھ کھلے پھول پر اوس ہوتی ہے۔ اور رونے لگی۔ اور روتے روتے اُس نے آخری انڈے کو چھری کے ساتھ ٹکورا۔ اور نیم ٹوٹے ہوئے انڈے کو فرائی پین میں اُلٹنے لگی۔ مگر دفعتاً رُک گئی۔

"انڈے کو دیکھئے۔ اس میں کیا ہے؟"

میں نے انڈے کو غور سے دیکھا۔ ایک ہلکی جھلی کے اندر کہیں دور ایک سُرخ خون کا قطرہ سکڑ اور پھیل رہا تھا۔ پتلی پتلی سُرخ لکیریں جھلی کے اندر انڈے کی سفیدی تک تیری ہوئی تھیں۔ اسی سفیدی نے ناشتہ اور ناشتے کے ساتھ ہم ہیں سے کسی

ایک کی غذا بنا تھا۔ میں نے کہا "گندا معلوم ہوتا ہے۔ پھینک دو"

"مگر یہ گندا تو دکھائی نہیں دیتا۔ بچہ بن رہا ہے۔ دیکھئے وہ دل بن رہا ہے۔ میں تو اسے فراٸی دان میں پھینکنے ہی والی تھی۔ وہاں سے خدا نے اپنا ہاتھ رکھ کے اسے بچا لیا ہے اب اسے پھینکنا مناسب نہیں ہے، خدا کی رضا یہی ہے"

"تو کیا تم خود مرغی بننا چاہتی ہو"

"اس میں کیا اعتراض ہے۔ ماں تو ایک ہی چیز ہے خواہ مرغی ہو خواہ عورت"

مگر میری بیوی نے فوراً ہی کہیں سے سگرٹوں کا خالی پچاسہ نکال لیا۔ وہ مجھے ایک آڑھتی نے دیا تھا۔ سگرٹ میں نے اسی دن پی ڈالے تھے، خالی پچاسے کو آٹے سے بھرنے کے بعد اس نے ادھ ٹوٹا ہوا انڈا اس میں رکھ دیا۔ اسے ہلکی آنچ پہنچانے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ پچاسہ باورچی خانے میں رہے،

سب کچھ کرنے کے بعد اس نے کہا

"یہ انڈا میرا تھا۔ مجھے بھوک سے کہیں زیادہ اس چوزے کی زندگی عزیز دکھائی دیتی ہے (سوچکر) کیا انڈے سے چوزا نکلے گا بھی؟"

"ذرا مشکل ہے۔ اسے سینک دینے والی بھی تو ہونی چاہیئے"

دونوں ننھے اٹھ بیٹھے تھے۔ رونے لگے۔ اور روتے ہوئے باورچی خانہ میں آ گئے۔ چھوٹے بھائی نے کہا کہ آج اُسے فیس ادا کرنی ہے۔ ناشتہ کرنے کے بعد بچے آنگن میں کھیلنے لگے۔ چھوٹا بھائی چلا گیا۔ اور میں بوشٹ کے نسخے کھینے لگا دفتر کا وقت ہو رہا تھا۔ جب میں نے سائیکل اٹھائی۔ بلقیس نے دبے الفاظ میں مجھ سے کہا

"اگر چوزا نکل آیا تو میں سمجھوں گی کہ آپ کو مجھ سے واقعی محبت ہے"

"یہ تو خطرناک امتحان ہے۔ مجھے تم سے واقعی محبت ہے"

"تو پھر چوزہ کیوں نہیں؟"

دفتری قسم کے بوسے اور جذباتی بوسے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد چوزہ انڈے سے نکل آیا صحت مند' ارادوں والا' نومولود چوزہ' اور سب کچھ۔ اس لئے ہوا کہ میری بیوی انڈے کا صبح و شام خیال رکھتی تھی۔ غالباً مرغی بھی اتنا خیال نہیں رکھتی۔ ان دنوں اُس کا کہنا تھا کہ یہ انڈا اُس کی محبتوں کا تعویذ ہے۔ وہ اپنی محبت کو آنچ دے رہی ہے۔ وہ پھر ایک بار ماں بن رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ماتا اور پاگل پن میں صرف لفظوں کا فرق ہے۔ اور میری بیوی میں دونوں باتیں تھیں۔

چوزہ کیا نکلا، میرے بچوں نے سمجھا کہ ان کا تیسرا بھائی پیدا ہوا ہے۔ اور میری بیوی تو اُس پر نثار تھی۔ اُسے چومتی۔ اپنی چھاتیوں پہ بٹھاتی۔ اُسے گیت سناتی۔ اس سے یہ نہ سمجھیں کہ وہ مجھ سے بے پرواہ ہو رہی تھی۔ ہرگز نہیں۔ وہ بہت زیادہ خوش تھی اس لیئے کہ چوزے نے نکل کر اُسے یقین دلا دیا تھا کہ میری محبت سچی ہے اور میں صرف اُسی کا ہوں۔ اب وہ مجھ سے کبھی ناراض نہ ہوتی تھی۔ اور مجھے کاروباری قسم کی محبت کرنے میں بھی رکاوٹ نہ تھی۔ مگر چوزے کے ساتھ میرا ایک رقیب پیدا ہو گیا تھا۔ جب میں اکیلے میں بیوی کو چومنا چاہتا تو کہیں نہ کہیں سے چوزہ ظاہر ہو جاتا۔ کبھی اُس کے پیارے اور لانبے بالوں کے اندر سے، کبھی اُس کی گردن کے نیچے پیلی سی چونچ دکھائی دیتی۔ اور کبھی کبھی تو وہ میری بیوی کے سینے ہی پہ بیٹھا رہتا۔ اور اُٹھنے کا نام نہ لیتا۔ میں نے ایک دفعہ سٹپٹا کر آخر کہہ دیا۔

"یہ چوزا میری محبت نہیں میری محبت کا چوکیدار ضرور ہے۔"

اور بلقیس مسکرا دی۔

دن گذرتے گئے۔ تینوں کو چوزے سے بے انتہا پیار ہو چکا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی جب ڈرائنگ کرتا تو چوزا اُسے سیدھی اور ٹیڑھی لکیروں کے بارے میں ہدایات دیتا جس کے باعث میرے چھوٹے بھائی اور چوزے کے درمیان تعلقات

خوشگوار نہ تھے۔ اس کے باوجود شام کے بعد چوزے کی حفاظت کا انتظام وہ خود ہی کرتا تھا۔ بعض دفعہ راتوں کو جاگتا رہتا کہیں بلی اُسے کھا نہ جائے۔ اور میری بیوی اس فخر سے میری طرف دیکھتی جیسے وہ دو کی بجائے تین بچوں کی ماں ہو۔ سب فخر روپے سے پیدا ہوتا ہے اور روپے کی میرے ہاں کثرت تھی۔

تو اُس رات آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ آخری جھینوں کا چاند ٹھنڈا تھا۔ بلقیس مجھے اتنی پیاری کبھی نہ لگی تھی جتنی اُس رات تھی۔ مجھے ہلکی ہلکی حرارت تھی۔ اس لئے وہ بھی کچھ افسردہ تھی۔ آہستہ آہستہ اُس نے میرے بالوں میں اپنی انگلیاں ڈال دیں۔ اور کوئی گیت گنگنانے لگی۔ اُس کا سر جُھکنے لگا۔ جھکتا گیا۔ اور دو بڑی آنکھوں نے کہا "محبت نظر تو نہیں آسکتی محسوس ضرور کی جاسکتی ہے۔" اور مجھے اس سے انکار کبھی نہ تھا۔

دفعتاً اک زور کا دھماکہ ہوا۔ اور اُس کے ساتھ میرے چھوٹے بھائی کی آواز آئی۔ "بلی۔ بلی۔!!" میری بیوی چونک اُٹھی اُس نے میرا سر ایک طرف پٹک دیا۔ اور آنگن کی طرف دوڑی۔ چوزہ زخمی ہو چکا تھا۔ اور سُرخ خون اینٹوں پہ جم رہا تھا۔ میری بیوی نے زخمی چوزے کو اُٹھا لیا۔ جیسے لوگ زخمی دلوں کو اُٹھا لیتے ہیں۔ اور بین کرنے لگی۔ مگر چند ہی منٹوں کے اندر اندر چوزے کی

جان نکل گئی — مرا ہوا چوزہ اور میری بیوی کی روتی ہوئی آنکھیں،
صبح کی خوبصورت روشنی!

کچھ وقفے کے بعد ملقیس نے کہا۔

"یہ چوزہ آخر کس لئے جیا تھا؟" اُس کی آنکھوں میں کچھ اور الفاظ تھے۔
اور کوئی دوسرے معانی، اُس کے بعد وہ مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہوئی۔
اور اُس نے کبھی محبت کا ذکر نہیں کیا۔

آڑے کا رنگ

داری اٹھارہ سال کی تھی۔ رنگ بھی اچھا تھا، اور کمر بھی پتلی تھی مگر بازار کا رنگ کچھ ایسا خراب تھا کہ جب لوگ اُس کے چبوترے تک پہنچتے تھے اُن کے دام ختم ہو چکے تھے۔ خالی جیب ذرا زیادہ شوقین ہوتی ہے۔ اس لئے داری چاندی کے روپوں کی بجائے قسم قسم کی باتیں سنتی تھی۔ ہفتے میں چھ دن ایسے ہوتے تھے جب لوگ اُس کی منت خواہش کرتے تھے۔ اور ساتویں دن ہیرا منڈی تھانے کا سپاہی اسلم خاں آجاتا تھا۔

اسلم خاں کا کہنا تھا اُسے داری سے عشق ہے!

میں اسلم خاں کو بُرا نہیں کہتا۔ وہ اندرون شہر کے محلے چوک چکلہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اس کی طبیعت عشق باز تھی۔ سپاہی اور خانگی کا ویسے بھی پرانا

مافوق ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ چوک چکلہ میں پیدا ہونے والا اسلم خاں بعد میں سپاہی بھی بنتا۔ جب وہ بارودی سپاہیوں میں شامل ہوا اُس وقت اُس کی تعیناتی موچی دروازے کے تھانے میں ہوئی۔ اور چونکہ موچی سے ہیرامنڈی دُور ہے۔ اس لئے اسلم خاں کی طبیعت ہمیشہ بے چین رہتی تھی۔ کوئی چیز اُسے اندر سے آواز دیتی اسلم خاں 'تمہاری منزل دُور ہے' اور وہ بڑی کوششوں سے تبادلہ کروا کے ہیرامنڈی آگیا۔

ہیرامنڈی تو وہ پہنچ گیا مگر سب خانگی عورتیں پہلے سے لگی ہوئی تھیں۔ ہیڈ کانسٹیبل سے لے کر تھانے دار تک سب کے سب عورتوں کے شوقین تھے۔ اور آخر بڑی کوششوں کے بعد اُسے داری نظر آئی۔ اور جب وہ نظر آئی وہ اُس پہ عاشق ہو گیا۔ ساتواں دن اس کا یوم عشق ہوا کرتا تھا۔

ہیرامنڈی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ نئی جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں بڑی طرحدار ہوتی ہیں۔ اُن کی جوانی خمیر اٹھے ہوئے آٹے کی طرح تیز ہوتی ہے۔ اس لئے وہ محلے کے دوسرے لڑکوں سے بھی گریز نہیں کرتیں اب جس جگہ داری بیٹھتی تھی اُس سے کچھ فاصلے پہ بڑے گوشت کے قصائیوں کا مکان تھا۔ اُن کا ایک لڑکا بھائی اسکول میں دسویں میں پڑھتا تھا۔ اور دو سال

سے فیل ہو رہا تھا۔ اُسے امتحانوں سے زیادہ محلے کی لڑکیوں سے پیار تھا۔ اور ہوتے ہوتے اُس کی آنکھیں داری سے بھی لڑ گئیں اور داری بھی اُس پر آ گئی جیسے سرسوں پر بہار آتی ہے۔

آزاد ہونے کے بعد جہاں اور بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ وہیں ایک تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ہیرا منڈی کی عورتیں کاروباری اعتبار سے طوائف کی بجائے عورت بن چکی ہیں۔ اب وہ گاہک نہیں مانگتیں خاوند مانگتی ہیں۔ یہ نفسیاتی حادثہ انجمن غیرتِ اسلام کی سرگرمیوں کے باعث ہے۔ کہ چکلے اٹھا دئے جائیں۔ اس خوف کے باعث کہ کہیں حکومت انہیں بے دخل نہ کر دے طوائفوں کا ماتی الضمیر بھی اُن کے قابو میں نہیں رہا۔ وہ جب بھی گاہک کے ساتھ پردے کے پیچھے جاتی ہیں حاملہ ہو جاتی ہیں۔

خوف نے اُن کی مامتا کو بیدار کر دیا ہے۔

داری کی سب سہیلیاں ایک ایک کر کے اپنے اپنے چبوتروں پر بیٹھیں۔ گاہک آئے۔ اور دیکھتے دیکھتے اُن کے ہاتھ پیلے ہوئے اور وہ دلہنیں بن کر مظفر گڑھ، میانوالی، بہاولپور، سکھیو، اور کراچی پہنچ گئیں۔ اُن کا سماجی مقام بدل گیا۔ اور جب بھی ملنے آئیں، ایسا دکھائی دیتا جیسے سچ مچ کی شریف

زادیاں ملنے آتی ہوں۔ داری بھی شریف زادی بننا چاہتی تھی۔ مگر اُسے شریف زادہ نظر نہ آیا تھا۔ اور جب اُسے بڑے گوشت کے قصائی کا لڑکا دکھائی دیا۔ تو اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دِل صرف اُسی کے قدموں میں رکھے گی۔ اور جب اُس نے دل رکھنے کا ارادہ کیا۔ شرافت اور بدنامی دونوں کے مفہوم بدل گئے۔ اور خدا خدا کر کے وہ دن آ گیا ـــــ

شوکت گو دسویں میں کئی بار فیل ہوا تھا مگر تھا تو وہ تعلیمیافتہ اور تعلیمیافتہ نوجوانوں کا پیار ذرا جذباتی ہوتا ہے۔ داری ہمیشہ اس انتظار میں رہی کہ کب اُسے موقعہ ملے تو اپنی محبت کا ماجرا کہے۔ اور ایک بعد دوپہر جب سارا دن لگا ہوا تھا۔ کٹڑی عنایت بائی کی سب عورتیں اپنے اپنے کمروں میں سو رہی تھیں۔ اور بڑے دروازے سے گزرنے کے بعد جو چھوٹی کوٹھڑی آتی ہے وہ خالی تھی۔ اُس وقت شوکت بھی کہیں سے آ نکلا۔ اور داری اُسے فوراً اُس کوٹھڑی میں لے گئی۔

کوٹھڑی تاریک تھی۔ ایک کونے میں چارپائی تھی جس پر دونوں بیٹھ گئے۔ داری اُس کی طرف دیکھتی رہی اور اُس کی آنکھیں تڑپنے لگیں۔ پیارا اور نازک سینہ تڑکی ہوئی جھیل کی طرح گہرا ہونے لگا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ شوکت کے قدموں

پر رکھ دیئے۔ شوکت نے اُسے گود میں بٹھا لیا۔

جب لوگ ہاتھ قدموں پر رکھتے ہیں۔ اور پھر گود میں آجاتے ہیں اُس وقت محبت پیدا ہوتی ہے '

پھر دونوں رونے لگے۔ اور روتے رہے۔ باہر ساون برستا رہا۔ اور محبت کا ایک پیلا شعلہ اندھیری کوٹھری میں اُجالا کرتا رہا۔

شوکت نے شادی کا وعدہ کیا۔ اور کہا کہ وہ دونوں بھاگ کر سکھر چلے جائیں گے۔ اور ساری عمر جُدا نہ ہوں گے۔

اُس روز بدھ تھا۔

دادی نے منت مانی ہوئی تھی۔ کہ اگر شوکت اُسے مل جائے تو وہ جمعرات کو روٹی دے گی۔ مگر روٹی تو مفت نہیں ملتی۔

اور دادی کی قسمت میں جو چبوترہ تھا اُس کی قسمت میں دام نہ تھے۔ اور ویسے بھی شوقین مزاج طبقے کی مالی حالت خراب تھی۔ طالب علم۔ وکیل۔ کالجوں کے پروفیسر۔ دفتروں کے کلرک۔ یہ تو ویسے بھی غریب لوگ ہوتے ہیں۔ اور زمیندار ٹھکانا پکھراج منزل سے نیچے کی بات نہ کرتے تھے۔ رہی سہی کمی وہ گلی پوری کر دیتی تھی جہاں دو گز کے فاصلے میں پچاس عورتیں بیٹھتی ہیں۔

اور جمعرات کو جیب تنہ سے پر بنچھنے سے پہلے منت کا ہونا ضروری تھا۔
بُدھ کی رات بھی بے کار ضائع ہوئی۔ صرف ایک اندھا فقیر اُس کی طرف آیا۔ اور
اُس کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگا "خدا کے لیے میرا دل خوش کر دے۔
خدا تجھے خوش کرے گا"
داری دل کی مسلمان تھی مگر ایسا کرنا مشکل تھا ——— جمعرات کی صبح بھی بدھ
کی رات کی مانند بغیر پیسے کے گزری۔
سب سے پہلے اُس نے اُدھار مانگنے کی کوشش کی۔ مگر اس طرف کا بازار مندا تھا۔
اور دوسرے اُدھار مانگنا زیب بھی نہیں دیتا۔ اور اسے اپنی شکل پہ مان تھا ———
اتنے میں شوکت آگیا۔ تو کسی بہانے وہ اُس سے باتیں کرنے میں کامیاب ہو گئی۔
داری نے کہا کہ وہ نیاز دینا چاہتی ہے مگر اُس کے پاس پیسے نہیں ہیں ———
شوکت نے سوچکر کہا کہ وہ انتظام کرے گا اور شام سے پہلے پہلے جو کچھ ہو سکا لے
آئے گا۔
مگر شوکت کی تقدیر بھی شاید چکر میں تھی۔ وہ گھر پر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اور
ماں نے اُسے مار مار کر گھر سے نکال دیا۔ وہ ساری دوپہر پھرتا رہا۔ سب دوستوں
سے پیسے مانگے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اور آخر شام کا دھواں پھیلنے لگا ———

اُس وقت اُسے ایک ترکیب سمجھ میں آئی !

بھاٹی دروازے کے تنور پر بھیڑ تھی - اور محلے کے لڑکے لڑکیاں اپنا اپنا آٹا بیٹھے روٹیاں لگوانے آئے ہوئے تھے ۔ تندور یا بُری طرح مشغول تھا۔ قسم قسم کی باتیں ہو رہی تھیں ۔

" پہلوان - پہلے نمبر میرا ہے "

" ارے تو تو ابھی آیا ہے "

" پہلوان جی ! اماں کہتی تھی روٹیاں موٹی لگانا "

" صبح کی روٹیوں کا ایک پیسہ مجرا دے "

سڑک پر سے ایک فٹن گذری تو تندوریا کھڑا ہو گیا - اور کہنے لگا " خاں صاحب ' سلام عرض کرتا ہوں "

فٹن پر مسکراتے ہوئے چہرے گذر گئے ۔

شوکت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سب آٹے گنے۔ کوئی بیس پرانتیں تھیں - مگر روٹیاں لگوانے والے اُنیس تھے۔ اُس نے حساب لگایا کہ اگر وہ ایک پرات اُٹھا لے جائے اور کسی دوسرے تنور پر جا کر روٹیاں بیچ دے تو سب کام ہو سکتا ہے۔ پرات بھی بک سکتی ہے - اور روٹیاں بھی - اور اُسے فوراً مستی دروازے میں اپنے دوست کا خیال

آیا جو اب تندرستیوں کا کام کرتا تھا۔ وہ ضرور اُس کی امداد کرے گا۔
وقت گذر رہا تھا۔
مگر سب سے مشکل بات تو یہ تھی کہ وہ کس پرات کو اُٹھائے۔ ہر پرات کے ساتھ ایک ملک کھڑا تھا۔ اور چھوٹے بچے پرات پر بڑی نظر رکھتے ہیں۔ اُس نے بڑی کوشش کی۔ ایک بچے کو کاغذ کی ناؤ بھی بنا کر دی مگر اُس کا ہاتھ پرات ہی پر رہا۔
تھک ہار کر وہ پراتیں زور زور سے گننے لگا۔ سڑک پر ٹریفک بھی زیادہ تھی۔ دس تک تو اس نے آسانی سے گن لیا۔ اس کے بعد اُس نے گننا بھی تھا اور عمل کرنا بھی۔ پندرہ، سولہ ــــ وہ گانے لگا "بادہ گردِ دل حزیں" "سترہ" یاد کے بزم نازمیں" "اور گذری ہوئی جوانیاں" کہتے ہی اُس نے انہیں کہا اور پرات لے کر بھاگ نکلا۔

"چور! چور!" سب چلائے
"میری پرات! میری اماں مارے گی" ہائے میری پرات"
"چور! چور! پکڑو"

اندرون بھاٹی دروازہ کی ٹریفک رُک گئی۔
جمعرات کی شام گذر گئی۔ اور رات آ گئی ــــ رات کے ساتھ خلاف معمول

اسلم خاں بھی آ گیا۔ اور دادی کو اُس کے ساتھ پردے کے پیچھے جانا پڑا۔ دادی کے ہونٹ سفید ہو چکے تھے۔ اور کوئی غیر معمولی غم اُس کی روح پہ سوار تھا۔

اسلم خاں نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ اُس نے کہا کہ بھاگی کے خود سے ایک لڑکا آٹے کی پرات لے کر بھاگ گیا تھا۔ وہ اُس لڑکے کے تعاقب میں بستی دروازے تک بھاگتا گیا۔ لڑکے کو پکڑ لیا گیا ہے۔ اب وہ حوالات میں ہے میں نے کہا چلو دریافت کرنے کے بعد دادی ہی کو ملتا آؤں ـــ کہتے ہیں وہ لڑکا اس محلے کا رہنے والا ہے۔ میں تو اُسے نہیں جانتا ـــ اُس کا نام شوکت ہے یا مروّت ہے! بھول گیا ہوں!

شوکت کا نام سنتے ہی دادی کے ہونٹ اور سفید ہو گئے

چارپائی پہ چڑھتے ہوئے اسلم خاں نے پوچھا۔

"آج تمہارے ہونٹوں کا رنگ عجیب ہے ـــ جیسے آٹے کا رنگ ہو!"

ہلکی ہلکی کرنیں

وہ یادداشتیں میرے دل کی کھلی ہوئی کلیاں ہیں مگر اُن سے کھلنے والے پھول مرجھا چکے ہیں۔ میں کانٹوں پہ پلکیں رکھتا ہوں اور اُن سے یہی کہتا ہوں "کیا وہ پھول پھر بھی آئیں گے؟" مگر کانٹے جواب نہیں دیتے۔ زمانے کے ہاتھ میں ایک بجھی ہوئی مشعل ہے۔ اور اُس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ مگر اُس نے جو تاج پہنا ہوا ہے وہ کانٹوں کا تاج ہے۔ میں خود عمر کی جس منزل سے گذر رہا ہوں اُس کا خمیر خوابوں اور تعبیروں سے پیدا ہوا ہے۔ کچھ اس لئے میری آنکھیں بھی غمگین ہیں اور میں پیچھے مُڑ کر دیکھنے پر مجبور ہوا ہوں۔ میرے کانوں میں جو الفاظ گونجتے ہیں وہ کہتے ہیں "گذرے ہوئے قدموں اور آنے والے قدموں کی چاپ ہمیشہ ایک سی ہوتی ہے"۔ میں پیچھے کی طرف دیکھ رہا ہوں مگر اس بات کا آرزومند ہوں کہ آپ آنے والے دنوں کی طرف دیکھیں . . . . . .

تو سب سے پہلے مجھے ایسی روشنی نظر آتی ہے جس کے اُجالے میں ہلکی ہلکی کرنیں ہیں۔ مگر رات کا اندھیرا اُن سے بغلگیر ہے۔ یہ بہت دیر کی بات ہے۔ اسے بھولنے والے بھی فوت ہو چکے ہیں۔ اور جو اسے یاد کرتے ہیں وہ کانٹوں سے اپنی آنکھیں زخمی کر لیتے ہیں ——— مگر آپ کہیں گے میں آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں! اے کاش آپ میرے دل کی چبھن جانتے ———

یہ ۱۹۳۱ کا واقعہ ہے۔ اُن دنوں کشمیر کی وادی اپنی نیند سے چونکی تھی۔ اور سب چونکنے والوں کی طرح اُس نے دلوں اور زخموں کے پھول پھینکے تھے۔ ان چیختے ہوئے زخموں اور دلوں پر سے فوجیوں کے کیل لگے ہوئے بوٹ گذرے اور سنگینیں اُٹھائے ہوئے سپاہی ہز ہائنس کی حکومت کا اعلان کرتے رہے!

اُن دنوں میں پرائمری کا طالب علم تھا۔ میرے سامنے نہ لوگوں نے کوئی نعرہ لگایا۔ اور نہ ہی کوئی گولی چلی۔ نہ تو شہر کے دروازوں کو آگ لگی اور ہی کسی کا باپ مرا، نہ کوئی یتیم ہوا اور نہ ہی کوئی عورت بیوہ ہوئی۔ شہر کی آبادی چپ چاپ تھی۔ اور لوگ بغیر جانب داری کے ساتھ کہیں دور چلتی ہوئی گولیوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ حالات سب سے زیادہ سرینگر میں خراب تھے۔ بارہ مولا کا بڑا بازار جل چکا تھا۔ شوپیاں، کٹھوعہ اور اوڑی میں بلوے ہوئے تھے۔ راجوری اور اُدھم پور، ریاسی اور بھدرواہ میں

پولیس کا ظلم بہت تھا۔ خاص طور پر اکھنور پر چناب کے کنارے فوجیوں نے لوگوں پر مشین گنیں کھول دی تھیں۔ میرپور اور کوٹلی میں کاروباری لوگوں کی کثرت تھی۔ وہ بلوؤں سے گھبرا کر جہلم اور راولپنڈی بھاگنے لگے۔ مگر جن لوگوں کے رشتے پنجاب کے شہر جہنگے تھے وہ ماندر کی ندی عبور کر کے پونچھ چلے آئے۔ راجوری سے آنے والے جھیلوں اور پہاڑیوں کو عبور کرتے ہوئے آئے تھے۔ گو جھیلوں پر کنول کھلے تھے اور پہاڑیوں پہ بنفشے کے پھول لیکن ان کی آنکھیں نسوار کے ڈبوں اور نمک کے ڈھیلوں پر رہتی تھیں۔ ان لوگوں کے آنے سے پونچھ کی آبادی ڈیوڑھی ہو گئی اور کاروبار بڑھ گیا۔ ان لوگوں کو میاں نظام کی حویلی میں ٹھہرایا گیا۔ جہاں گورنمنٹ سکول کی پرائمری اور ہائی کلاسوں کے کمرے ہوا کرتے تھے۔ اور جن دنوں کشمیر نیند سے جاگا تھا۔ ہمارے سکول میں گرمی کی چھٹیاں تھیں!

ان مہاجرین کو ہم سب کوٹلی والے کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پونچھ سے قریب تر اگر کوئی قصبہ تھا تو وہ کوٹلی تھی۔ کوٹلی تحصیل تھی۔ اور پونچھ ہز ہائنس راجہ صاحب پونچھ کی راجدھانی تھی۔ اس لئے ہم جب انہیں کوٹلی والے کہتے تھے تو اس میں احساس برتری بھی ہوتا تھا۔ مگر کوٹلی والوں کے لئے احساس برتری یا کمتری کا کوئی بھی مطلب نہ تھا۔ وہ بلوائیوں سے ڈر کر آئے تھے۔ اور بلوائی بدمعاش ہوتے ہیں۔ اس لئے

پونچھ کے شریف آدمی بدمعاش لوگوں سے نفرت کرنے لگے تھے۔ نفرت کرنے والوں میں ریاستی حکومت کے اہل کار پیش پیش تھے۔

بدمعاشوں سے مراد مسلم کانفرنس کے لوگ تھے اور جو مسلم کانفرنس کی تحریک آزادی کو کہا جاتا تھا ——

حالات کا پیرا ڈرامائی تھا۔ اور آبادی متحرک تھی اس لئے جب پونچھ شہر کی آبادی بڑھ گئی تو لوگ رات کے وقت چوری کرنے لگ گئے اور دن کے وقت ان کا پیشہ دکانداری کہلانے لگا۔ اہل کاروں اور شریف آدمیوں کے لئے یہ ڈرامہ نما زندگی مخدوش تھی۔ اس لئے محلہ داروں نے مل کر رات کو پہرہ دینے کی ضرورت محسوس کی۔ اس سے نتیجہ یہ ہوا کہ ہوتے ہوتے سب اہل کاروں نے اپنا اپنا سامان گورنمنٹ سکول میں بند کر دیا۔ اور خود راتوں کو تلواریں باندھ کر پہرہ دینے لگے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کا سالا پہرہ دینے والوں میں سب سے زیادہ پرجوش تھا۔ اور جس رات وہ ہمارے ہاں چائے پی رہا تھا۔ اس نے تھانیداروں کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ پیٹی پر ایک چمکدار وسل تھی۔ کمر پر اس نے ایک لمبی تلوار باندھ رکھی تھی۔ اور فوجی جوتوں پر ملکہ وکٹوریہ کے فوجی افسروں کی مانند لوہے کی باوضع تیل تھی۔ جسے انگریزی میں سپر کہتے ہیں! جب سب اہل کار اسلحہ خرید چکے تو گورنمنٹ سکول کے سیکنڈ ماسٹر صاحب بھی پستول لے آئے۔ تاکہ

رات کے وقت چوروں اور نقب لگانے والوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

سیکنڈ ماسٹر صاحب نے اسلحہ اور بارود کا کبھی استعمال نہ کیا تھا۔ اور ریوالور کی انہیں کبھی ضرورت نہ پڑی تھی۔ ان کی ساری عمر تاریخ جغرافیہ، سائنس اور جیومیٹری پڑھانے میں گذری تھی۔ پھر بھی حالات کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ وہ ہر رات ریوالور میں گولیاں ڈال لیتے اور ریوالور کو سرہانے رکھ کر سو جاتے۔ ایک رات کھٹکا ہوا۔ کوئی لکڑی کی سیڑھیوں پر سے اتر رہا تھا۔ دبے دبے قدموں کے ساتھ۔ صحن میں اندھیرا تھا۔ اور کونے میں اُگا ہوا ایلم کا درخت خوش تھا۔

بچے سوئے ہوئے تھے۔ اور غالباً کوئی ڈراونا خواب دیکھ کر چونک گئے تھے۔ سب سے چھوٹے نے رونا چاہا۔ مگر باپ کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ڈر گیا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی سے کہا

"چور! چور"

دونوں بھائی لحاف کے اندر گھس گئے۔ مگر درز بنا کر جھانکنے لگے۔ سب سے بڑا بھائی اپنی والدہ کے پاس بیٹھ گیا جو آیت الکرسی پڑھ رہی تھیں۔ سیکنڈ ماسٹر صاحب نے ریوالور پکڑتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔

"کون ہے؟"

کوئی آواز نہ آئی

باہر نکلتے ہوئے اُنہوں نے پھر کہا "کون ہے" آواز آئی "میں ہوں"

اور اندھیرے میں سے نکل کر ایک غریب سا لڑکا لالٹین کی روشنی میں آگیا۔

اُس نے بتایا وہ قریب کے مکانوں میں کسی شادی پر آیا ہُوا تھا۔ اور راستہ

بھول کر اُن کی چھت پر چلا آیا۔ آئندہ وہ ایسا نہ کرے گا۔ پُونچھ میں سب

مکانوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں ——— سیکنڈ ماسٹر صاحب

نے اُسے جانے دیا۔ بچے پھر سو گئے!

کچھ دنوں کے بعد سیکنڈ ماسٹر صاحب کے بڑے لڑکے نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں

کو بلایا۔ اور اُنہیں اندر کے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ٹرنک اور اُن کی والدہ

کے زیوروں کا ڈبہ رکھا رہتا تھا۔ کمرے میں صرف ایک روشن دان تھا۔ جس سے آسمان

دکھائی دیتا تھا ــــ کچھ دیر کے بعد بڑے لڑکے نے کہا،

"میرے پاس پستول ہے"

دونوں چھوٹے بھائیوں نے کہا "کیا وہ چلتا ہے؟"

بڑے لڑکے نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ پستول واقعی پستول ہے نمبر تین کی

طرف نشانہ لگاتے ہوئے کہا "کیا نہیں نشانہ لگاؤں"

نمبر تین کھِل کھِلا کر ہنسنے لگا۔

"ہنہیں! تم ابھی چھوٹے ہو"

نمبر تین چپ ہو گیا۔

بڑے لڑکے نے ریوالور نمبر دو کی طرف پھیرتے ہوئے کہا "بڑے زور کی آواز آئے گی۔ ایک دو تین پر گھوڑا دباؤں گا"

نمبر دو پستول دیکھ کر ڈر گیا۔ اور کہنے لگا "نہیں! گولی آسمان کی طرف جائے تو نظر بھی آئے گی"

"گولی کیسے نظر آسکتی ہے؟" بڑے لڑکے نے کہا

"موہن کہتا ہے گولی نظر آتی ہے" نمبر دو نے جواب دیا

"موہن بکواس کرتا ہے"

اور یہ کہتے ہوئے اُس نے روشندان کی طرف پستول پھیرتے ہوئے گھوڑا دبا دیا۔

ایک ہیبت ناک آواز کے ساتھ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ اور بارود کی بو پھیل گئی۔ باورچی خانے سے بھاگ کر آتی ہوئی والدہ غش کھا گئی۔ درزی کی دکان پر بیٹھے ہوئے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سیکنڈ ماسٹر صاحب کے تینوں لڑکے

صندوقوں کے نیچے گھس گئے ——!

شہر پونچھ میں اگر کہیں مسلم کانفرنس کی تحریک آزادی کا پتہ چل سکتا تھا۔ تو وہ قلعے پر چڑھی ہوئی توپیں تھیں۔ شہر کے رہنے والوں کو جس توپ سے زیادہ ڈر لگتا تھا۔ وہ "دیوی توپ" کہلاتی تھی۔ سب کا کہنا تھا کہ اس کا قبر بہت جلال پیدا ہوتا ہے۔ اور اسے چلانے کے لئے ڈیڑھ سو بکروں کی قربانی دینا لازم ہوتی ہے دوسری توپ بارہ بجے والی توپ تھی اس کی آواز سب پہچانتے تھے، دن کے وقت یہ توپیں خموش رہتی تھیں۔ اور ڈوگرہ سرکار کا جھنڈا، لال اور کیسری رنگوں کے ساتھ قلعے پر راجپوت دوشیزاؤں کی طرح مسکراتا رہتا تھا۔ مگر رات کے وقت یہ توپیں فیر کرتی رہتی تھیں۔ اور ان کی گرجدار آواز پہاڑوں میں گونجتی تھی، بچے چونک اٹھتے تھے۔ اور اہل کار سرکار کے دبدبے کو محسوس کرتے تھے۔ راجپوت عورتیں ڈوگری زبان میں بلوائیوں کو برا بھلا کہتی تھیں۔ اور مسلمان کلمہ پڑھا کرتے تھے۔

مگر اس سارے اہتمام کے باوجود شمال اور جنوب سے آنے والی سڑکیں بدستور سوتی رہیں۔ چٹانیں خموش رہیں۔ لوگ خموش رہے۔ اور مسلم کانفرنس کشمیر میں موت اور زندگی کا کھیل کھیلتی رہی۔ پونچھ کا دل دھان کی کھیتوں کے مانند گیلا رہا۔ اور شہر کی فضا اسی طرح یکساں رہی جیسے وہ مدتوں سے رہ رہی تھی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد یہ

فضا ایسی بدلی کہ اُس کا اثر آج بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی ڈوگرہ فوجیوں کے آنے سے ہوئی۔ کشمیر کے مہاراجہ صاحب نے پونچھ کے ہز ہائنس کی امداد کے لئے ریاستی فوجوں کے بہت سے سپاہی یہاں بھیج دیئے۔ اُن کا آنا ایک نئے دور کا آنا تھا۔ ایک نئی زبان اور ایک نیا اندازِ فکر۔ وہ ایک نئی زندگی لائے تھے!

اُن کے آنے سے پہلے شہر پونچھ کی فضا معصوم تھی۔ لوگ اچھے تھے۔ مسلمان اور ہندو ایک تھے۔ دونوں کے درمیان جب بھی کوئی ڈرامہ پیدا ہوتا تھا وہ رومانوی نوعیت کا ہوا کرتا تھا۔ مگر ان فوجیوں کے آجانے سے ہندوؤں نے کہا کہ مسلمان بدمعاش ہوتے ہیں۔ اور مسلمانوں نے کہا کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں۔ مگر وہ ایک چیز ضرور جانتے ہیں کہ ہندو لڑکیوں کی آنکھیں غش کھائی ہوئی کبوتری کی طرح پیاری ہوتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونو ہنس دیے۔ اور ان کی محبتوں کا افسانہ پرانی راہوں پر تیرتا رہا۔ مسلمانوں کی محبت پائیدار تھی۔ اور ہندوؤں کا تبسم عشق انگیز تھا۔ اسلام اور آریائی کلچر مغل کہانیوں ہی کا نتیجہ بن رہے تھے!

چھاؤنی شہر سے ذرا دور تھی۔ مگر پونچھ کے رہنے والے فاصلوں کی پروا نہیں کرتے۔ اس لئے روزانہ شام کے وقت چھاؤنی دسہرے کے میلے کی طرح پُر رونق ہوتی تھی۔ بلوائی چونکہ یہاں تھے نہیں اس لئے ڈوگرہ فوجی بھی فارغ

تھے۔ ہر روز شام کے وقت چھاؤنی میں ڈھول بجنے لگتا۔ اور لوگ جمع ہونے لگتے۔ ڈوگرہ سپاہی گھیرا ڈال بیٹھتے اور ان کے درمیان ناچنے والے آجاتے، وہ جس قسم کا ناچ ناچا کرتے تھے اُسے بھنگڑا کہتے ہیں۔ مگر جو بھنگڑا پنجاب میں ہوتا ہے وہ ڈوگرا سپاہیوں کے ناچ سے بہت مختلف ہے۔ ان کا ناچ ایک حد تک مہذب کہا جا سکتا ہے کیونکہ اُس کی حرکتیں مخصوص اور جچی تلی ہوتی ہیں مگر جہاں پنجاب کے دیہاتی ناچ اپنی آوازوں میں جنسی جذبے کو برملا نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو میں نے سنا نہیں۔ ڈوگرہ سپاہیوں کا ناچ جنسی جذبے کا ناچ ہوا کرتا تھا۔ ناچ کے وقت ان کی حرکتیں جنسی ارادوں کی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ اور جو آوازہ وہ دیتے تھے۔ اس کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے۔

"طوفان آیا، طوفان آیا۔ اور بہتے ہوئے آئی ٹالی (شیشم)

سب ایک آواز میں کہتے " او ڈھولیا"

" اُدپر سے وہ گوری چٹی۔ ہے اندر سے کالی"

" او ڈھولیا "

اور بسا اوقات ان کے ناچ میں کہانی کا جربہ بھی ہوتا۔

" تجھ سے چڑھائی کیوں طے نہیں ہوتی؟"

دوسرا ساتھی جواب دیتا

"میری کمر ٹوٹ چکی ہے"

پہلا سپاہی پھر پوچھتا ۔۔۔"

"تیری کمر کیوں ٹوٹی ہے؟"

"کیا تو نے بوجھ اٹھایا تھا جو وزنی تھا"

"میرے بوجھ سے بھی تو فرق نہ آئے گا"

"او ڈھولیا ۔۔۔"

چھاؤنی کے ڈوگرہ سپاہی ناچتے رہے۔ اور پونچھ شہر کا خوش چہرا دمکتا رہا۔ مدار پور سے آنے والی سڑک اسی طرح اونٹوں اور خچروں پہ نمک، گڑ اور ٹین کی چادریں لاتی رہی۔ گوجر خان سے بھیجا ہوا آڑھت کا مال برابر ملتا رہا۔ رینگڑی اور جھانجل کو جانے والی سڑک پہ ڈوگرہ سپاہیوں کی رسد پہنچتی رہی۔ رفتہ رفتہ سری نگر میں فضا خوش ہوئی۔ اور مسلم کانفرنس کا ابلتا ہوا لاوا ختم گیا۔ مرکزی مجلس قید ہو گئی۔ لوگ مرجھا کر چپ ہو گئے۔ اور کشمیر کی تحریک آزادی دب گئی۔ اس صورت حال کو ختم کرنے والا ہاتھ گلابی تھا۔ انگریزی حکومت کا تشویشناک دستانہ جس نے آزادی کی خواہش کو کشمیر کی وادیوں میں اس کانٹے کی طرح نوچ دیا تھا جس پہ بلبل اپنا

سینہ زخمی کرتی ہے تا کہ بہاروں کے دن لوٹ کے آئیں،
آہ وہ بہاریں جو کبھی کبھی نہیں آتیں!

میاں نظام دین کی حویلی جس میں گورنمنٹ سکول کی پرائمری اور مڈل کلاسوں کے کمرے ہوا کرتے تھے، اور جہاں ۱۹۳۱ میں "کوٹھی والے" ٹھہرے تھے ایک عجیب و غریب عمارت تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے جو عمارتیں اینٹوں اور چونے سے بنتی ہیں۔ ان کا دل نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ان کی کوئی روحانی وضع قطع ہوتی ہے مگر اس حویلی کی سب وضع قطع رومانی اور رومانی ہونے کے باعث روحانی تھی۔ اُنیسویں صدی میں راجہ موتی سنگھ کا وزیر نظام دین یہاں رہتا تھا۔ اس حویلی کے دو حصے تھے۔ مردانہ حصہ گورنمنٹ سکول نے لے لیا تھا اور زنانہ حصہ تقدیر نے اپنی جنبشوں میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس لئے جہاں وزیر زادیاں اور خواصیں، باندیاں اور داشتائیں رہتی تھیں۔ وہاں اب درخت اُگتے تھے، کوے انڈے دیتے تھے۔ اور سانپوں اور مینڈکوں کی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ زنانہ حصے کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ویران تھا۔ اور ویران ہونے کے علاوہ بھیانک اور ہولناک بھی تھا۔ دُور سے دیکھنے پر یہ عمارت چار منزلہ تھی۔ مگر زنانہ حصہ منزلوں کی قید سے آزاد تھا۔ اگر چوتھی منزل کی چھت گرنے لگی تھی تو باقی کی منزلیں بھی رُک نہ سکی تھیں۔ اس لئے زنانہ حصے میں بہت کم کمرے ایسے تھے جن کی

چھتیں تھیں۔ لیکن ان کمروں کے اندر بھی بھنگ کے بوٹے اُگے تھے۔ اور زیر سایہ نباتات کانگو کے جنگلوں کی مانند تھی۔ ہم انہیں دیکھ کر جغرافیۂ عالم میں لکھے ہوئے دریائے کانگو کا طاس یاد کیا کرتے تھے ۔۔۔ "نو" مردانہ کمروں میں پڑھائی ہوتی تھی مگر زنانہ حصّے میں ہر وہ کام ہو سکتا تھا جس کی اسکول کا سلیبس اجازت نہیں دیتا۔ اُس زمانے میں اسکول کے استاد سخت گیر اور ظلم پسند ہوا کرتے تھے۔ ان کی نظر میں اچھائی سزا سے پیدا ہوتی تھی۔ اس لیے جو رشتہ طالب علم اور استاد کے درمیان پیدا ہوتا تھا کسی طرح خوشگوار نہ تھا۔ اُستاد کے جبر و استبداد سے بچنے کے لیے طالب علم حویلی کے زنانہ حصے میں چھپے رہتے تھے ۔۔۔

جن دنوں میں نویں میں پڑھتا تھا اس وقت فورتھ ہائی کا کمرہ اُس جگہ تھا جہاں حویلی اپنے دونوں حصوں کو برابر برابر تقسیم کرتی تھی۔ اس کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں جو زنانہ حصے کی طرف کھلتی تھیں۔ مگر جنہیں لکڑی کی چپٹیاں لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک کھڑکی پر چاک سے لکھا رہتا تھا "جنت کی کھڑکی"۔ دوسری کھڑکی کا نام "دوزخ کی کھڑکی" تھا۔ طالب علموں نے دوزخ کی کھڑکی پر سے چپٹیاں ہٹا کر گذرنے کے لیے راستہ بنا رکھا تھا ۔۔۔ فورتھ ہائی کا کمرہ چوتھی منزل پر تھا۔ مگر تقدیر کی امداد بر وقت موجود رہتی تھی۔ پہلی منزل پر اُگنے والا انجیر کا درخت چوتھی

منزل سے بھی اُونچا ہو چکا تھا۔ اس لیے جو طالب علم اُستاد سے ڈر کر بھاگتا تھا وہ درخت سے اُتر کر زیر سایہ نباتات میں گم ہو جاتا تھا۔ اور سارا دن وہیں رہتا تھا ـــــ

فورتھ ہائی تک نہ تو میں نے کبھی سگرٹ پی تھی۔ اور نہ ہی کبھی میں جماعت سے گم ہوا تھا۔ جب میں نویں میں پہنچا تو دونوں باتیں ایسے دستیاب ہوئیں جیسے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جن کے ساتھ اسکول کی زندگی کبھی ہموار نہیں رہتی۔ اور مجھے عموماً اُستادوں کے ظلم و استبداد کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ جب میں ریاضی کا سوال غلط حل کرتا اس وقت بھی مار پڑتی۔ اور جب میں غلط سوال کا کتاب کھول کر صحیح جواب بتاتا تب بھی اُستاد مارنے سے دریغ نہ کرتا۔ حالات یہیں تک محدود نہ تھے۔ جب میں نکر پہنتا تب بھی مار پڑتی کہ سلوار پہن کر کیوں نہیں آیا۔ اور اگر بالوں میں تیل لگاتا اور پھر انہیں سنوار کر سکول آتا تب بھی اُستاد کی تلخی، طمانچے اور طرڑی کا بید میرا انتظار کرتے۔

ان حالات سے تنگ آکر میں نے وہ کیا جو شریف لوگ عموماً کرتے ہیں ــ "جو راستہ ہلاکت کو پہنچائے اُس سے بچ کر رہو" اور میں دوزخ کی کھڑکی سے نکل کر زنان خانے میں اُگے ہوئے انجیر کے درخت تک جا پہنچا۔ میں بلندی سے

پستی کی طرف جا رہا تھا مگر میری آتمائیں واقعی نجات کی خواہشمند تھیں ـــ اور جب میں زیرِ سایہ نباتات میں گھس گیا تو مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ اب میں ہر تکلیف اور قید سے آزاد ہو چکا ہوں۔

میری طرح کے بہت سے طالب علموں نے اس حصے میں آرام سے دن گذارنے کے لئے ایک آرام دہ کمرہ چن رکھا تھا۔ اسکول سے اٹھائی ہوئی بنچیں۔ کرسیاں اور ٹاٹ یہاں تھے۔ ایک بلیک بورڈ بھی موجود تھا۔ چاک کا ڈبہ بھی اور بورڈ صاف کرنے کا ڈسٹر بھی؟

مگر سب سے نمایاں چیز حقہ تھا۔ حقے کے علاوہ تار اور لیمپ کی ڈبیاں، قینچی مارکہ سگرٹ۔ چاند بی بی، سس ۱۹۳۵ اور پیڈرو کے سگرٹ عام تھے۔ یہاں میری ملاقات اُن سب سے ہوتی جو زندگی کو بازی گردں کا تماشہ سمجھتے ہیں۔ اور آرام سے سگرٹ پیتے ہیں۔ وہ سگرٹ پیتے تھے۔ گانے گاتے تھے۔ اور ہنستے تھے۔ مگر جب کبھی اُستاد کی یاد آتی وہ مغموم ہو جاتے اور وہ ایسے چونک پڑتے۔ جیسے نیند سے جاگا ہوا مسافر چونک پڑتا ہے۔ جب اُس کا زادِ راہ خطرے میں ہو!

اس حویلی کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں چڑیلیں اور بھوت رہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے جنوں کو دیکھا بھی تھا۔ نذیر کی اماں کہتی تھیں کہ وہ ہر رات کو یہاں آگ جلتے دیکھتی

ہیں ۔ رمضانی نے ہارمونیم بجتے ہوئے سنا تھا ۔ اور جب ڈرائنگ ماسٹر صاحب نے ایک صبح ننگے پاؤں کے نشانات دیکھے تھے تو وہ ڈرائنگ ماسٹری سے استعفار دینے کی سوچ بیٹھے تھے ۔ کچھ یہی بات تھی کہ جب طالب علموں نے ویرانے میں قیام کیا تو وہ بھوتوں اور چڑیلوں کے خوف سے عموماً تعتیں گا کر پڑھا کرتے تھے ۔ اور جب ایک طالب علم نے اس کمرے کو عبادت خانہ کہا تو یہ نام فوراً مشہور ہو گیا ۔ کیونکہ عبادت خانہ بُری روحوں سے بچاتا ہے ۔ اور نیک لوگوں کی حفاظت کرتا ہے ———

——— ایک دن غلام محمد ہیڈ ماسٹر صاحب کے پیش ہوا ۔ اُسے دو درجن کی سزا ہوئی ، مار کھانے کے بعد وہ عبادت خانے میں آگیا ۔ نہ اُس نے سگرٹ پیا اور نہ ہی اُس نے اپنی مشہور قوالی سنائی "باغ نشاط کے گلو ۔ ناز کران کران دلو !" وہ چپ چاپ بیٹھا رہا ۔

سب اُسے دیکھتے رہے ۔

آخر وہ اُٹھا اور پاس کے درخت سے چھڑی کاٹنے لگا ۔ اُس نے کہا وہ غلیل بنا رہا ہے ۔

جس اُستاد نے اُسے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پیش کیا تھا وہ ہسپتال جاتے ہوئے اُس کے گھر کے قریب سے گذرتا تھا ۔

"میں اُس کی دوا کی بوتل پھوڑ دوں گا" اُس نے کہا
اور تیسرے دن اُس نے ہسپتال جاتے ہوئے اُستاد کی بوتل پھوڑ دی۔ بوتل میں ہاضمے
کی دوا تھی ۔۔۔ غلام محمد ٹوٹی ہوئی بوتل اپنے ساتھ لایا۔ اُسے عبادت خانے میں رکھ
دیا گیا جیسے وہ کوئی بہت بڑی علامت ہو!
دو لڑکوں کو دو درجن کی سزا اس لئے ہوئی کیونکہ وہ عشقیہ نظمیں لکھتے تھے۔
اُستاد نے کہا
"تمہیں عشق کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ تمہارا عشق کچا ہے۔ عشق صرف خدا کی ذات سے
ممکن ہے۔ شاعری صرف خدا کے نام پر لکھی جاتی ہے۔"
جب اُنہوں نے کہا کہ وہ عشق حقیقی کرتے ہیں تو اُستاد چلّا کر بولا
"حقیقی؟ عشق حقیقی تو فنا ہو کر بھی نہیں ملتا۔"
ایک طالب علم نے کہا "فنا کسے کہتے ہیں؟ میں عشق میں فنا ہونا چاہتا ہوں!"
مگر دو درجن کی سزا سارے مفہوم بتا دیتی ہے۔ لیکن ان شاعروں کے آنے سے
عبادت خانے کی فضا ادبی ہو گئی۔
رفتہ رفتہ عبادت خانے کی آبادی بڑھنے لگی اور اسکول کی حاضری کم ہونے
لگی۔ آخر ایک روز اسکول کے عملے نے چھاپہ مارا۔ لیڈروں کو سزا ہوئی۔ اور

عبادت خانہ بند ہو گیا۔

زندگی کا چلن دھیرے دھیرے خاموش بڑھتا رہا جیسے خوبانی کے درختوں میں پھول آتے ہیں۔ پتے نکلتے ہیں۔ پھل آتا ہے پکتا ہے اور پھر مرجھانے لگتا ہے۔ اور جب خزاں آجاتی ہے درخت بہار کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ اور آخر بہار پھر آتی ہے۔ پونچھ کی زندگی خطِ مستقیم پر واقع تھی۔ یہ سیدھا خط واضح تھا۔ اور اسے بتانے والوں نے ہر ایک خطرے کا پہلے سے انتظام کیا ہوا تھا۔ اس لیئے ان راستوں پر نہ چٹانیں تھیں اور نہ ہی طوفان، نہ گرجتے ہوئے بادل، اور نہ ہی ٹوٹتی ہوئی بجلیاں۔ لیکن پونچھ چٹانوں، طوفانوں، بادلوں اور بجلیوں کی جگہ تھی۔ اس کی برساتیں قدرت کے زندہ ہونے کا ثبوت دیتی تھیں۔ اس لئے جب بھی ساون لگتا تھا پونچھ کی ندی میں طغیانی آجاتی تھی۔ اور دیہات میں بسنے والے مویشی اور لوگ بہنے لگتے تھے۔ ایسے حادثوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہز ہائنس راجہ صاحب نے ہاتھیوں کی ایک جوڑی خریدی ہوئی تھی۔ گو ہاتھی سواری کے تھے لیکن راجہ صاحب موٹر میں سفر کیا کرتے تھے۔ اور ہاتھی دریا کے آر پار جانے، اور بہتے ہوئے لوگوں کو بچانے کا کام سرانجام دیتے تھے — میں سمجھتا ہوں کہ ان دنوں حکومت شخصی ضرور تھی تاہم اس حکومت میں انسانی دل دھڑکتے تھے۔ اور راجہ

ریاست کے لوگوں سے کبھی بھی دُور نہ تھے!

خوبانی اور شفتالو کے باغات میں زندگی نے کروٹ لی اور پونچھ میں تھیٹروں کا رواج ہوگیا۔ زندگی اور تھیٹروں کا کوئی روحانی رشتہ ضرور ہے۔ اور ریاست میں تھیٹر بھی نئی چیز نہ تھے۔ رہس اور رہس دھاری لڑکے پہلے سے موجود تھے۔ اپنی زندگی میں لمبے بالوں اور ستواں ناک کے آرٹسٹ نما لڑکے سب سے پہلے میں نے یہیں دیکھے تھے۔ دیوالی۔ جنم اشٹمی، دسہرہ کی کہانیاں تو سنسکرت زمانے سے رونما ہوتی تھیں اور ان کا مزاج آوارہ یا ئی تھا۔ مگر جو کھیل ۱۹۳۱ کی ناکامی کے بعد شروع ہوئے تھے وہ نئے تھے، میں نے "یہودی کی لڑکی" اور "عالم آرا" پونچھ کے تھیٹروں پر دیکھے۔ "باوفا عاشق"، "نورِ اسلام"، اور "قتل تمیزن" بھی یہیں کھیلے گئے تھے، مگر مجھے "سوہنی مہینوال" اچھی طرح یاد ہے۔

پونچھ کے قلعے کے قریب ایک مستطیل وضع کی عمارت کا نام اصطبل تھا۔ اس اصطبل میں منڈوا بنایا گیا تھا۔ پردے چار تھے۔ اور بازو کے پردوں پر فواروں کی تصویریں تھیں۔ چونکہ عمارت اصطبل کی تھی اس لیے جن کمروں میں گھوڑے باندھے جاتے تھے وہ ایک طرح کے تماشہ دیکھنے والے احاطہ کے ایک طرف خاموش کھڑے رہتے تھے۔ جیسے ماضی کے مرحوم گھوڑوں کی روحیں تماشہ

دیکھ رہی ہوں۔ جس زمانے میں "سوہنی" کھیلی جا رہی تھی اصطبل گھوڑوں سے خالی تھا۔ گھوڑے کی جگہ موٹر نے لے لی تھی۔ اصطبل کے کمروں کی چھتیں گر چکی تھیں اور متواتر بارشوں سے کمروں کے فرش پر گھاس اور لانبے لانبے بھنگ کے بوٹے اگ آئے تھے۔ کمرے غائب ہو چکے تھے مگر ان کے ڈھانچے موجود تھے۔ دیواریں موجود تھیں ـــ ۔ اسکول کے طالب علموں کو تماشہ دیکھنے کی ممانعت تھی۔ اس لیے اسکول کے طالب علم باقاعدہ تماشائیوں میں بیٹھ کر تماشہ دیکھنے سے مجبور تھے۔ وہ اصطبل کی دیواروں پہ بیٹھ کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اور میں اُن میں سے ایک تھا ـــ ہم سب کے سب بغیر ٹکٹ کے تماشائی تھے!

پردہ اٹھا اور کورس شروع ہوا۔ کورس کے الفاظ "ہر شجر میں ہر ثمر میں جوت تیری ہے ہری" کو درباری کا رنگ دیا گیا تھا۔ ڈرامے کی ایکٹرسوں نے ہاتھ پرنام کی شکل میں باندھے ہوئے تھے۔ اور ایکٹر دلوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ مہینوال نے کلغی لگائی ہوئی تھی ـــ پہلا سین شروع ہوا، جہاں سوہنی گھڑوں کی دکان پہ بیٹھی ہے۔ تو تماشائیوں نے زور زور کی داد دی۔ جو لڑکا "سوہنی" بنا تھا وہ شہر کے خوبصورت لڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ڈرامہ چلتا رہا۔ اور ہم اصطبل کی دیواروں پہ سے دیکھتے رہے،

اس سین میں جہاں "مہینوال" سوہنی سے پوچھتا ہے

"اے خوبصورت دوشیزہ! تیرا نام کیا ہے؟"

اور سوہنی جواب دیتی ہے

"میں کیسے بتا سکتی ہوں کہ مجھے سوہنی کہتے ہیں"

اصطبل کی دیوار پر بیٹھے ہوئے کچھ طالب علموں نے مہینوال پر کنکر پھینکے ۔ مگر جب مہینوال پارٹ کھیلنے کے بعد اسٹیج سے چلا گیا تو اس نے ڈرامہ کھیلنے والوں کو بے ٹکٹ تماشائیوں کے بارے میں کہا۔ کہ وہ نہ تو پیسے خرچ کرتے ہیں مگر پتھر پھینکتے ہیں۔ یہ سن کر جن لوگوں کا پارٹ ذرا دیر میں آنا تھا وہ دیواروں پر سیڑھی لگا کر چڑھ گئے۔ ان میں "سوہنی کا باپ" "مہینوال" اور "ایک بوڑھی عورت" بھی شامل تھے۔ طالب علموں نے دیکھا اور بھاگنے لگے۔

دیوار پر پھسلن تھی۔ بہت سے لڑکے پھسل گئے اور بھنگ کی اُگی ہوئی جھاڑیوں میں گر گئے۔ اور زور زور سے رونے لگے۔

آخر ڈرامے والوں نے ان سب کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اور آخری سین شروع ہوا جہاں سوہنی کچے گھڑے پر تیر کر جاتی ہے ———

ڈرامہ ختم ہوا۔ تو ڈائرکٹر نے کمپنی کی طرف سے شکریہ ادا کیا۔ ڈرامہ بغیر ٹکٹ دیکھنے والوں کا

ایک موٹا شخص تھا۔ اُس کے جانے کے بعد تماشائیوں میں سے ایک آدمی آگے بڑھتا۔ اُس نے سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور عینک لگائی ہوئی تھی۔ سب لوگ اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُس نے نہایت ادبی لہجے میں کہا کہ ڈرامہ کامیاب رہا ہے۔ اور کاسٹ نے خاطر خواہ تاثر پیدا کیا ہے۔ اُسے سوہنی مہینوال دیکھ کر، رومیو اور جولیٹ کی یاد آگئی ہے ——

اسکول کے طالب علموں نے تالیاں بجائیں۔ اور کہا

"یہ رام سنگھ ہے جو ابھی ابھی ولایت سے لوٹا ہے"

کچھ دنوں کے بعد پونچھ گزٹ میں اس طرح کا اعلان ہوا۔

بحکم سرکار والا مدار سری راجہ صاحب بہادر والئی پونچھ

ہر گاہ کہ اس امر کا اعلان کیا جاتا ہے کہ سری سرکار والا مدار کی خوشی سے ڈاکٹر رام سنگھ، ایم بی بی ایس، ایم۔ آر سی (لندن) کو ریاست پونچھ کا افسر اعلےٰ شفاخانہ جات مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صاحب موصوف سرکار والا مدار کے ذاتی معالج بھی ہوں گے۔

(دستخط) فیروز چند

وزیر وزارت

حادثے جب بھی رونما ہوتے ہیں ان کی آمد فی الفور ہوتی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ یہ حادثہ کیوں ہوا۔ مگر بعض حادثوں کی کیفیت اس لیے بھی معنی خیز ہوتی ہے کیونکہ ان کے ذریعے کسی اجتماع کی اندرونی خواہشوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ کیلے کے چھلکے سے پھسل کر موٹر کے نیچے آجانا بھی ایک حادثہ ہے۔ مگر وہ حادثہ عظیم الشان ہوتا ہے جو بہت سے لوگوں کو نیند سے چونکا دیتا ہے۔ اور جب وہ جاگتے ہیں تو اپنی پیٹھ پر اٹھایا ہوا بوجھ پھینک دیتے ہیں۔ اور دوبارہ سورج کا چمکتا ہوا مُنہ دیکھتے ہیں۔

جس حادثے سے آزادی پیدا ہوتی ہے وہ حادثہ نہیں ہوتا۔ اور جس حادثے کا میں ابھی ذکر کروں گا وہ نہ صرف حادثہ تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا۔

شہر پونچھ میں جمعے کی نماز حسبِ معمول چپ چاپ ادا ہوا کرتی تھی۔ حسب معمول خطبہ سنا جاتا تھا۔ اور درود پڑھنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ مگر اس جمعے کی صورت اور تھی۔ نمازی خاموش تھے۔ اور مسجد کی محراب عجیب و غریب دکھائی دیتی تھی۔ جمعے کی نماز کے بعد بتایا گیا کہ مقامی جیل میں توہینِ قرآن ہوئی ہے۔ توہین کا مرتکب چیف ہیڈ لکل آفیسر ہے۔

توہینِ قرآن نے سب طرف بے اطمینانی اور نفرت پھیلا دی۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا

تھا کہ میڈیکل آفیسر جیل خانے کا معائنہ کر رہا تھا اس وقت ایک مسلمان قیدی تلاوت میں مصروف تھا۔ میڈیکل آفیسر نے اپنے پالش کیے ہوئے جوتے کے ساتھ مقدس کتاب کو ایک طرف گرا دیا اور حکم دیا کہ قیدی چیف میڈیکل آفیسر کو ضابطے کے مطابق سلام کرے!

میں نے پوچھا "تو کیا اُس نے سلام کیا ہے؟"

سبحان جُو نے سوچتے ہوئے کہا "بعض کہتے ہیں کہ کیا ہے مگر اوروں کا کہنا ہے کہ اُس نے سلام کرنے سے انکار کر دیا تھا"

جیل خانے کے حکام کا کہنا تھا کہ خبر غلط ہے۔

میں نے کہا "افواہ معلوم ہوتی ہے"

مگر سبحان جُو نے ساری کہانی دہرا دی۔ اور آخر میں کہا "اب گولی چلے گی"۔

دوسرے دن سرکاری باغ میں چائے کی دعوت تھی۔ جس میں شہر کے لوگ اور اہل کار حاضر تھے۔ صبح سے سرکاری بینڈ بج رہا تھا۔ اور رسالے کے سپاہی گشت لگا رہے تھے۔ دعوت پر راجہ صاحب نے آنا تھا۔ مقامی مسجد میں جلوس نکالنے کا ارادہ کیا گیا۔ تاکہ سرکاری باغ کے باہر راجہ صاحب کو کہا جائے کہ دادرسی کی جائے اور ملزم کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

جلوس نعرے لگاتا ہوا نکلا - اُن کے ہاتھوں میں سبز جھنڈے تھے -
اُنہوں نے کہا " توہینِ قرآنِ کریم "
جلوس ایک آواز میں بول اُٹھا " مردہ باد "
اور زندہ باد اسلام کہتے ہوئے جلوس والے سرکاری باغ کی طرف بڑھتے گئے -
سرکاری باغ کے پاس آکر جلوس رُک گیا - سرکار کی موٹر آ رہی تھی - دوسری موٹر میں
وزیر تھا - جلوس کے منتظموں نے کہا
" مسلمانو " موٹروں کے سامنے لیٹ جاؤ - راستہ روک دو " توہینِ قرآن کو یاد رکھو "
بچے اور سکول کے طالب علم بھاگ گئے - اور جلوس سڑک پر کاروں کے سامنے زمین
پر لیٹ گیا -
کاریں رُک گئیں -

راجہ صاحب نے وفد سے ملنے کا وعدہ کیا ——
مگر حالات آنے والی بہار کی طرح پُر جوش ہوتے گئے - جلسوں میں نظمیں پڑھی جانے
لگیں - بچے گلی گلی توہینِ قرآن کا ذکر کرتے - اور ایک شاعر کی نظم بہت مشہور ہو گئی
جسے اُس سال رمضان کے مہینے میں جگانے والے نوجوان قوالی کی طرز میں گایا کرتے
تھے اُس کا ایک مصرعہ یہ تھا " قرآن مقدس کی توہین پہ یاد رہے کٹ جائے گا سر بچہ

بچہ ہمارا''

نہ بات چیت سے کوئی بات طے ہوئی۔ اور نہ ہی جلسہ اور جلوسوں کا کوئی نتیجہ نکلا،
آخر ہز ہائنس سری راجہ صاحب نے سری نگر کی مسلم کانفرنس کو تار دیا۔ کہ شیخ محمد عبداللہ
آکر مفاہمت کرو ادیں۔

جس روز شیر کشمیر نے آنا تھا وہ دن بہت خوبصورت تھا۔ مسلم کانفرنس کے قائد
کی گاڑی کو پانچ سو آدمیوں نے کھینچا تھا۔

وہ ریاست کے مہمان تھے۔ آخر مفاہمت ہو گئی۔

اور ڈاکٹر ہرنام سنگھ کو چیف میڈیکل آفیسر کے عہدے سے ہٹا دینے کا وعدہ کیا۔
مگر جب وہ چلے گئے حالات پھر مخدوش ہو گئے۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔
پہاڑیاں اور چٹانیں زندہ ہو گئیں۔ دور دور سے رضا کار آنے لگے۔ اور شہر کی فضا
نئی نئی آوازوں سے گونجنے لگی۔ ریاستی حکام نے فوج کو مسلح رہنے کا حکم دے دیا۔
توپیں صاف کی گئیں۔ لال اور کیسری جھنڈا پھر مسکرانے لگا جیسے راجپوت دوشیزائیں
جوہر کی رسم ادا کرنے سے پہلے مسکرایا کرتی ہیں۔

شہر کی مسجد میں جلوس کی تیاری کا انتظام ہوا۔ اور اپنی اپنی گرفتاریاں دینے کے لئے
لوگ نام لکھوانے لگے۔

جس دن جلوس نکلنا تھا۔ سارے بازار مسلح فوج سے بھرے ہوئے تھے۔ رسالہ اور توپخانہ مستعد تھا۔ سکول میں چھٹی نہ تھی۔ اور ہم سب میاں نظام دین کی حویلی میں سہمے ہوئے تھے۔

ہمارے کان خواہ مخواہ گونجتے تھے۔ جیسے گولیاں چل رہی ہوں۔

دفعتاً آواز آئی "نعرۂ تکبیر!"

ہجوم پکارا "اللہ اکبر"

اور ہمارا سانس رک گیا۔ ہم اس امید میں تھے کہ اب گولیاں چلیں گی۔ ہمارے اشتیاق کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہم نے کبھی گولیاں برستے ہوئے نہیں دیکھی تھیں۔

جلوس نکلا۔ سب طرف سبز جھنڈے اور جھنڈیاں تھیں۔ مکانوں کی چھتوں پر کشمیری عورتیں کشمیری میں گیت گا رہی تھیں۔ وہ مائیں تھیں جن کے بیٹے جلوس کے شامل تھے۔

اس دن گرفتار ہونے والوں میں مقامی مسلم کانفرنس کے دو کارکن نمایاں تھے۔

غلام نادر اور غلام احمد۔

دونوں نے کالا لباس پہنا ہوا تھا۔ گلے میں چاند اور تارا تھا اور ہاتھ میں قرآن شریف کے حمائل ایڈیشن تھے۔

وہ آہستہ آواز میں "یا نبی سلام علیک" پڑھ رہے تھے۔

چھتوں پر عورتیں کشمیری میں گیت گا رہی تھیں۔

"خدا کے نام پر میرا بیٹا وداع ہو رہا ہے

میں بہت خوش ہوں

جیسے ڈل پر تازہ کنول کھلتا ہے

یوں میری محبتوں کے پھول کھلے ہیں،

میرے بیٹے رخصت!

رخصت، میری آنکھوں کے تارے!"

فوجیوں نے سنگینیں چڑھا لیں۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس آگے بڑھے۔

ہم گولی چلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

پولیس نے گرفتاریاں لے لیں۔ اور گولی نہ چلی۔ کوئی بھی زخمی نہ ہوا۔ زمین خون

کی پیاس سے محروم رہی۔

قیدیوں کو ۴۵ میل دور لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔

وہ تیسرے دن پیدل چل کر واپس آ گئے

جس دن وہ واپس پہنچے ڈاکٹر رام سنگھ کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔

پہاڑیاں خموش ہو گئیں۔ اور نظمیں چپ چاپ فراموش ہونے لگیں۔

کچھ دنوں کے بعد میاں نظام دین کی حویلی میں بات کرتے ہوئے ایک نے کہا

"اگر گولی چلتی تو بہت مزا آتا"

دوسرے نے جواب میں کہا

"آواز سے پہاڑیاں گونج جاتیں"

مگر نہ تو گولی چلی تھی نہ پہاڑیاں گونجی تھیں — مگر جو کچھ ہوا تھا وہ ۱۹۳۱ کی گونج تھی۔

اور کون کہتا ہے صدائے بازگشت سے گونج پیدا ہوتی ہے۔

ایک کلی دو پتیاں

وہ کچھ دنوں سے جھنڈے کا ڈیزائن بنا رہا تھا۔ دیکھنے میں تو ڈیزائن کا معاملہ کچھ مشکل نظر نہیں آتا لیکن بناتے بناتے صدیاں گذر جاتی ہیں۔ اور نہ جھنڈا پیدا ہوتا ہے اور نہ ڈیزائن۔ جھنڈا اگر کپڑے کا پھریرا ہے تو پھریرے پہ محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دو تین رنگوں کی گز ولا سے جھنڈا بن سکتا ہے۔ اور ڈیزائن کوئی سا بھی کیوں نہ ہو چل جاتا ہے۔ ضرورت اگر ہے تو جھنڈا اٹھانے والوں کی ہے۔ وہی نہیں ملتے جھنڈے ہزاروں ہیں —— یہ باتیں ہمارے لئے سطحی اور آسان ہیں۔ مگر وہ انہی باتوں پہ عرصے سے مصروف تھا۔ اس کے مسائل کچھ اس نوعیت کے تھے۔ جھنڈا کیا چیز ہے؟ وہ کن علامتوں اور خواہشوں کا مظہر ہوتا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ صرف ایک ہی علامت استعمال کی جائے۔

چاند اور ستارے سے کیا مراد ہے؟ اس نے سوچا کہ چاند سے مسلمانوں کی تہذیبی صبح مراد ہے اور ستارے سے اس صبح کا استقلال نظر آتا ہے۔ مگر چاند اور ستارا تو موجود ہیں وہ تہذیبی صبح کہاں ہے؟ اور جب تک وہ صبح دکھائی نہ دے گی چاند اور ستارے کا مفہوم کھوکھلا رہے گا۔ آسمانوں پہ چمکنے والے چاند کے لیئے زمین پر لوگوں کی ضرورت بھی ہے مگر نہ تو لوگ موجود ہیں اور نہ زمین۔ یہ چمکدار آسمان خلاؤں پر پھیلا ہوا ہے۔ اور لوگ زمین کے نیچے سوئے ہوئے ہیں۔ قیامت آ چکی ہے۔ اور محشر کا اعلان ہونے والا ہے۔

اس نے سوچا کہ اگر جھنڈے پر اسرافیل کا نشان بنایا جائے تو اس سے آنے والے دنوں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

مگر اسرافیل کا نشان کیا ہوگا؟ صور اسرافیل۔ مگر بگل ذرا جھنڈے پر کم پھبتا ہے۔ اور صبح کے اعلان میں انسانی جذبات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ بگل دھات کا چمکدار ساز تو ضرور ہے۔ مگر اس کی آواز میں تھرتھراہٹ ہوتی ہے۔ ایک زلزلہ نما کیفیت۔ جیسے کالی ہوائیں بیابانوں میں چیخ رہی ہوں۔ یا قیامت کے دن مردہ روحوں کا دربار ہونے والا ہو۔

تو کیا قیامت واقعی ہو چکی ہے؟

اگر قیامت سے مراد لوڈ کا ڈھیر ہے۔ تو کہیں نہ کہیں ایسا ہی کا ڈھیر دور نظر آنا چاہیئے۔ وہ

اس نتیجے پر پہنچا کہ قیامت ضرور آچکی ہے۔ گوڑ کاؤ کی صورتیں دھندلی ہیں۔ ایک دھند پھیلی ہوئی ہے جس نے سب اشیاء کو ڈھانپ رکھا ہے۔ سب صورتیں ایک جیسی ہیں۔ ایک پھیلا ہوا قبرستان جس میں ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں، اور سات سو سال سے دفنائے ہوئے مریض کھوکھلی آنکھوں سے صبح کی آمد کے منتظر ہیں۔

دفعتاً اس قبرستان میں کہرام مچ گیا۔ اور سات سو سال سے دفنائے ہوئے مُردے اپنے کفن اتار کر باہر نکل آئے۔ ان سب کے آگے ایک بے کفن لاش تھی۔ جس کے گلے میں چاند اور ستاروں کا پھریرا لٹک رہا تھا۔ سارے سوکھے ہوئے درخت اور خشک دریا سہم گئے۔ دور سے ایک لمبا رسہ سانپ کی طرح رینگتا ہوا قریب آیا۔ جسے اس بے کفن لاش نے پکڑ لیا۔ فوراً ہی اس رسے نے کسی پھندے کی شکل اختیار کر لی۔ اور وہ بے کفن لاش خودکشی کرنے لگی۔

موت کے بعد موت!

اس نے سوچا کہ جھنڈے کا ڈیزائن تجریدی آرٹ کا نمونہ ہونا چاہئے۔ مگر اسے بے کفن لاش سے ڈر لگتا تھا۔ گو وہ قیامت کا معتقد تھا تاہم قیامت سے تو مراد نئی زندگی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ نئی زندگی خوشیوں کا وعدہ ضرور دے گی۔ اس لئے جس ڈیزائن کی اسے تلاش ہے وہ نئی صبحوں کی خوشخبری کیوں نہ دے، اور وہ

خوش خبری کا انتظار کرنے لگا!

دوسری شام جب وہ رات کی چائے پینے پرانی دکان پر پہنچا تو سب اُس کے منتظر تھے۔ سب اُس سے کہنے لگے کہ جھنڈا کب تیار ہوگا۔ اور جھنڈے پر کس قسم کا نشان ہوگا۔ اُنہوں نے اپنے کوٹ اور قمیضیں اُتار دیں۔ اور اپنے سینوں کی پسلیاں گننے لگے۔ سب سے چھوٹی عمر کے طالب علم نے کہا "اس جگہ میرا دل دھڑکتا ہے' میں اس دل کا خون دے دوں گا۔' کیا جھنڈے پر سُرخی کی گنجائش بھی ہے؟"

کسی نے جواب میں کہا

"سُرخی دو قسم کی ہوتی ہے۔ وہ گہری سُرخی جو ڈوبتے ہوئے سورج سے پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ نئی اور تازہ دم سُرخی جو صبح کے گلناری چہرے سے ظاہر ہوتی ہے۔ موت اور زندگی دونوں کی رنگت سُرخ ہے۔"

چھوٹی عمر کے طالب علم نے کہا

"کیا میں اپنی زندگی کا خون دے سکتا ہوں تاکہ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی پیدا ہو سکے؟"

پُرانی دکان پر جلتی ہوئی موم بتیوں کا زرد شعلہ بھڑکنے لگا۔

اُس نے جتنے بھی لوگ بیٹھے تھے ان پر نظر دوڑائی۔ سب کی رنگت بھوک اور بیماریوں

سے بیلی پڑ چکی تھی - مگر اُن کی آنکھوں میں ایک آدرش بے طرح تڑپتی تھی۔

سب سے پہلے بوڑھی عمر کا شخص اُٹھا - اُس کے بال سفید تھے - خزاؤں نے اس کے بالوں پر ساٹھ بار ہاتھ پھیرا تھا - جس سے نہ صرف اُس کے بال سفید ہو چکے تھے بلکہ جہاں جہاں سے وہ گذرا تھا وہاں سے بہاریں بھی رخصت ہو چکی تھیں - اُس نے کہا

"ہم سب کسی ہونے والی صبح کا انتظار کرتے ہیں - مگر لفظوں کی خوبصورتی سے دھوکا ہوتا ہے - میں صرف یہ پوچھتا ہوں - صبح کیا چیز ہے ؟"

صبح کیا چیز ہے - آنے والی صبح کیا ہے - صبح کا چہرہ گلناری کیوں ہے ؟

سب خموش ہو گئے - چھوٹی عمر کے سب طالب علم اور نئی نسل کے شاعر، کہانی لکھنے والے اور کالجوں کے اُستاد سب خموش ہو گئے - عدالتوں کے جج - صوبوں کے گورنر اور قومی مجلس کے عہدہ دار چپ ہو گئے - یونیورسٹی نے اپنے دروازے بند کر لئے -

مگر پرانی دکان کے اندر کسی نے جواب دیا -

"صبح رات کے جسم سے پیدا ہوتی ہے - مگر رات نہیں ہوتی - صبح اور رات میں روشنی کا فرق ہے - صبح روشنی لاتی ہے اور رات اندھیرے دیتی ہے"

بوڑھی عمر کے شخص نے کہا — "الفاظ! الفاظ! الفاظ"

پرانی دکان نے دہرایا۔ "الفاظ! الفاظ! الفاظ!"

رات نے زرد موم بتیوں پر اپنی پلکیں رکھ دیں اور کہنے لگی "الفاظ چھوڑ دو، مفہوم کی تلاش کرو۔"

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور دیکھا کہ سب خوش تھے!

چھوٹی عمر کے طالب علم سے نہ رہا گیا۔ وہ ڈرتا ڈرتا اٹھا۔ اور کہنے لگا —

"کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟"

بوڑھے نے کہا "مجھے اعتراض نہیں ہے مگر نوعمر نوجوان جذبات پر ٹوٹتی ہوئی ناؤ کی طرح بے قابو ہوتے ہیں!"

مگر نوعمر طالب علم نہ رکا اور بولا —

"میں ابھی نوعمر ہوں۔ اور میرا خون میری رگوں میں تانبے کی طرح پُرجوش ہے! مگر ایسی حالت کچھ سال پہلے نہ تھی۔ اُن دنوں جب میں بادلوں میں کھلی ہوئی قوسِ قزح کو دیکھتا تھا۔ تو میرا دل رنگوں کی خواہش کرتا تھا۔ میں اُڑنا چاہتا تھا۔ مجھے چاند اور ستاروں سے پیار تھا۔ اُن دنوں میں نے رضیہ سے محبت بھی کی۔ رضیہ اچھی، اور جذبات کی مانند معصوم لڑکی تھی۔ وہ سب

فاقہ کرتے تھے۔ وہ، اس کے بہن بھائی اور اُس کے ماں۔ باپ کو مرے ہوئے دو سال ہوتے تھے۔ وہ کارخانے میں دس گھنٹے کام کرتا تھا۔ اور ۱۲ روپے آنے کماتا تھا۔ مگر اُسے نعتوں سے پیار تھا۔ وہ گانے ناپسند کرتا تھا۔ مگر جو گیت مدنی رسول کے قدموں میں لکھے جاتے تھے اُن گیتوں میں اُس کا دل تڑپتا تھا۔ کئی بار وہ مدینے کے خوبصورت محبوب کو اپنے آنسوؤں سے یاد کرتا۔ رضیہ کہا کرتی تھی کہ رات کی تنہائیوں میں وہ عرب کے حسین آقا کو پکارتا تھا۔ جیسے لوگ اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کو آواز دیتے ہیں۔؟

پرانی دکان میں سب کے سب چلا اُٹھے —— "پھر کیا ہوا؟"

نوعمر طالب علم نے کہا۔ "اُن دنوں ایک تحریک اُٹھی۔ جذبات اور دھڑکنوں کی ایک کہانی! اُسے ہم تحفظِ ختم نبوت کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ تحریک اُسی عربی محبوب کے ناموس کو چومتی تھی۔ اور جیسے مرغی اپنے پروں کے تلے اپنے چوزوں کو جمع کر لیتی ہے۔ اُس تحریک نے اُس ناموس کو اپنے دل میں جمع کر لیا —— اور عربی پیغمبر کے قدموں میں زندگی کے آنسو اور محبتوں کی دھڑکنیں بچھا دیں"

پرانی دکان کی موم بتی تڑپنے لگی۔ رات کا نوحہ سوکھے درختوں سے ٹکرانے لگا

"اُس تحریک کے چلانے والے خود غرض تھے" نوعمر طالب علم نے کہا "اُنہیں عرب کے محبوب سے کوئی پیار نہ تھا۔ وہ اُس کی آڑ میں اپنے لئے عشرت کی تتلیاں چاہتے تھے — تحریک ناکام ہوگئی۔ اور اُس محبوب کی محبت پر مرنے والے مرگئے — رضیہ کا باپ مرنے والوں میں سے ایک تھا۔"

پرانی دکان کا دل ٹوٹ گیا۔ اور اُس سے آنسوؤں کے ہار نکلے اور فرش پر گرنے سے ہی مرجھا گئے ——

نوعمر طالب علم کہتا گیا۔

"میں پوچھتا ہوں کہ اِن مرنے والوں کی موت کا ذمے دار کون ہے! کیا مرنے والوں کی محبت خلوص سے خالی تھی؟ کیا خون کا نذرانہ عربی رسول کی محبت نہیں لے سکتا۔ مگر عربی پیغمبر بھی خوش رہا۔ وہ مدینے کی خاک میں سویا ہوا اتا جدار بھی خوش رہا۔ اور آسمانوں پر خدا کی آواز بھی بند ہوگئی! وہ قوس قزح پھر آئی۔ بہاریں پھر آئیں۔ اور پھر سرسوں کے کھیت پھولے۔ مگر رضیہ کا باپ نہ لوٹا۔ کارخانے کی کوک اب بھی بجتی ہے مگر رضیہ کا باپ بستر سے نہیں اٹھتا۔ اُس کا بستر خالی ہے۔ وہ مرچکا ہے۔ اور لوگ اُس تحریک کی ناکامی کے بعد اُس کے نام سے خوف کھاتے ہیں۔ مگر رضیہ، اُس کی ماں، اُس کے دو بہن بھائی اُسی تحریک کو

یاد کرتے رہے۔ جب ان کا پیارا باپ مرا تھا۔ جب اُن کا پیارا باپ کسی دُور کے خیالی محبوب پر جان دیتا ہوا ہمیشہ کے لئے چھین گیا تھا۔ لوگ اُسی محبوب کا اب بھی ذکر کرتے ہیں۔ مگر رضیہ کا باپ نہیں لوٹتا۔ عرب کا شہزادہ اب بھی موجود ہے اور موجود رہے گا مگر رضیہ کا باپ تو مر چکا ہے!"

نوعمر طالب علم نے پھونک مار کر قریب کی جلتی ہوئی موم بتی بجھا دی اور کہا

"جیسے یہ موم بتی بجھی ہے یونہی رضیہ کے گھر کا چراغ بجھ گیا تھا۔ آپ اس موم بتی کو پھر جلا سکتے ہیں مگر رضیہ کے گھر روشنی نہیں ہو سکتی —— میں کہتا ہوں وہ اُس روز سے بیمار ہیں۔ اُن کی بیماری بھوک کی بیماری ہے۔ رضیہ کی ماں بھی مر گئی۔ اُس کے بہن بھائی بھی مر گئے۔ اور آخر میں وہ رخصت ہو گئی۔ وہ مری نہیں اور یہی میرے لئے دکھ کی بات ہے!"

نوعمر طالب علم نے کہا کہ رضیہ باپ کے مرنے کے بعد پاگل سی ہو گئی تھی۔ جب مسجدوں سے اذان کی آواز آتی وہ اپنے کواڑ بند کر لیتی۔ باپ کی زندگی میں اُن کے ہاں دو تصویریں تھیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اُن کے ہاں نعتوں کی کچھ کتابیں تھیں جس میں مولانا جامی کی یہ نعت بھی تھی "نسیما جانب بطحا گذر کن" رضیہ نے تصویریں پھاڑ دیں۔ اور عربی محبوب کی شان میں

رکھے ہوئے گیتوں کو آگ لگا دی، محبت کے گیت جلنے لگے۔ اور رضیہ روتی رہی۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے نیلے آسمان کو دیکھا۔ جس پر صبح کا ستارا ابھی چمکتا ہے۔ مگر وہ روتی رہی۔ آسمانوں سے کوئی آواز نہ آئی۔ کسی نے اُسے سہارا نہ دیا۔ اور وہ محبت کی آگ پہ آنسوؤں کا نذرانہ دیتی گئی۔ یہاں تک کہ صبح مشرق سے شرمیلی دلہن کی طرح جھانکنے لگی ——

مگر صبح آئی۔ تو رضیہ کا پتہ نہ لائی۔ رضیہ چلی گئی۔ وہ دیوانی تھی اُسے معلوم نہ تھا کہ لوگ حادثوں کو قبول کرتے ہیں اُن کو محسوس نہیں کرتے۔ اور اب وہ اپنی شہروں میں گم ہے ——

اور جب رضیہ آئے گی صبح بھی طلوع ہو گی۔

نوعمر طالب علم نے کہا "اور جب صبح طلوع ہو گی میں قوسِ قزح کو پیار بھی کروں گا۔ اور پھولوں پہ بہار کی اوس بھی چوموں گا۔ اور جب تک صبح نہیں آتی میں اپنی محبتوں کا ماتم کرتا رہوں گا!"

پرانی دکان نے اپنی آستین سے موم بتیوں کے آنسو پونچھے۔ اور نوعمر طالب علم خاموش ہو گیا۔

نوعمر طالب علم کی باتیں سن کر بوڑھے نے کہا۔

"رضیہ کے باپ نے محبت کے نام پر جان دی ہے۔ وہ ہماری محبتوں کا نذرانہ ہے۔ جب

تک یہ محبتیں موجود ہیں وہ موجود رہے گا ——— اسی محبت کے آغوش سے پھوٹنے والی روشنی کا نام صبح ہے"

مگر پرانی دکان کے اندر سب بے چین تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ صبح آئے گی تو ضرور مگر وہ کب آئے گی؟

بوڑھے نے مشرقی کونے میں جلتی ہوئی موم بتی کو اُٹھایا۔ اور اُسے اپنے سفید بالوں کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں کہوں کہ صبح آچکی ہے۔ ہر طرف صبح کی روشنی ہے۔ مگر صبح باہر طلوع نہیں ہوتی۔ صبح کی روشنی تمہارے دلوں میں ہے۔ صبح کی خوشگوار ہوا تمہارے سانس میں ہے۔ صرف تمہیں اس کا شعور نہیں ہے!"

کسی نے پوچھا کہ شعور کب پیدا ہوگا؟

بوڑھے نے اُداس آواز میں کہنا شروع کیا "یہ مجھے معلوم نہیں! مگر صبح کی روشنی تمہارے آس پاس بکھری ہے۔ اُس کا منبع ریگستانوں کی وسعتوں میں ہے۔ وہ تمہارے دور کی تاریخ ہے اور جیسے دنوں سے مہینے اور مہینوں سے سال بنتے ہیں۔ اور جیسے سالوں سے صدیاں بنتی ہیں یونہی تمہاری رونما ہوتی ہوئی صبح تیرہ گردوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ماضی اور مستقبل دونوں کی آنکھیں حال کی

نبضوں پر رہتی ہیں۔ اپنی نبضوں کا احساس کرو۔ صبح کی روشنی تمہارا احساس کرے گی!"

پرانی دکان کا جسم کانپنے لگا۔ اور اُس میں چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ موم بتیوں کا زرد شعلہ بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ صبح کی روشنی کی مانند پھیل گیا۔ اور اس روشنی میں تصویروں کے بعد تصویریں اُبھرنے لگیں ــــ

سب سے پہلی تصویر روشنی کی تصویر تھی۔ جیسے زندگی کا سورج پہلی بار طلوع ہو رہا ہو۔ اس روشنی سے زمین کا دل دھڑکنے لگا۔ اور بنفشے کی کلیاں اُگنے لگیں۔ سُرخ گلاب کے پھول کھلے اور ان پر صبح کی اوس چمکنے لگی،

اس تصویر سے دور ایک بجتی ہوئی شہنائی تھی۔

پھر شہنائی بھی چپ ہو گئی اور روشنی کا دھارا مدھم ہونے لگا۔

مختلف تصویروں پر مختلف لوگ نمودار ہوئے۔ اُن کی آنکھوں میں روشنی تھی۔ اور ان کے دل آرزوؤں سے خوش تھے۔ وہ دریاؤں اور ندیوں کو عبور کرنے لگے۔ اور ان کی سفید داڑھیاں اور سفید ہوتی گئیں۔ آخر ان کی کمر جھکنے لگی اور وہ آسمانوں کی جانب دیکھنے والے لوگ زمین کو دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔

پھر ان کا دم ٹوٹ گیا۔ اور وہ مر گئے۔

جب وہ مر گئے تو سب طرف سے ہجوم در ہجوم لوگ آئے۔ ان کے ہاتھوں میں اینٹیں۔ لوہے کی سلاخیں اور نقش و نگار بنانے والی قلمیں تھیں۔ انہوں نے مرے ہوئے بوڑھوں کے گرد دیواریں چن دیں۔ اور ان دیواروں پر بوجھل اور تاریک گنبد رکھ دیئے۔ جب وہ گنبد رکھ چکے۔ تو انہوں نے دیواروں پر خوبصورت عبارت لکھی۔ انگور کی بیلیں۔ عشق پیچاں کے پھول اور بلخ کی صراحیاں، اور سب طرف سرو کے درخت اگا دیئے، اور آخر کار ان گنبدوں کے اوپر بیٹھ گئے۔ گنبد ان کے وزن سے ٹوٹنے لگے، مگر وہ ان پر بیٹھے رہے۔ اور قبروں کے تعویذوں کے نیچے مرے ہوئے بوڑھوں کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ وہ ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ ان بوڑھوں کے جبڑے ٹوٹ گئے مگر گنبدوں پر بیٹھے ہوئے لوگ بدستور بیٹھے رہے۔

اور صدیوں کی صدیاں گزر گئیں۔ جیسے کاغذ کے ہاروں سے ہار نکلتے ہیں۔ مگر گنبدوں پہ بیٹھے ہوئے لوگ بدستور بیٹھے رہے۔ وہ بیٹھے رہے اور موٹے ہوتے گئے یہاں تک کہ ان کا وزن گنبدوں کے وزن سے بھی بڑھ گیا۔ اور مٹی میں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں پسنے لگیں۔ اور ان سے سرمہ بن گیا جسے مٹی میں رہنے والے جانوروں نے لگایا اور صحت یاب ہونے لگے۔ مگر گنبد پہ بیٹھے ہوئے لوگوں کی بینائی

بھی جاتی رہی۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے لوہے کی بھاری زنجیروں کے پنجرے بنا لیے۔ اور گنبدوں پر پنجروں کا بوجھ بھی پڑنے لگا۔ آخر زمین نے کروٹ لی۔ اور زمین میں رہنے والے جانوروں نے زمین پر چمکتی ہوئی روشنی کو دیکھا۔ اور رونے لگے۔ وہ رونے لگے کیونکہ وہ جن ہڈیوں سے صحت یاب ہوئے تھے وہ پس رہی تھیں۔ گنبدوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اُن پر تیزاب اور پتھروں کی آتشباری کی۔ اور وہ مرنے لگے ان کی موت سے ایک نوحہ پھیل گیا —— گنبدوں پر بیٹھے ہوئے لوگ بگل بجانے لگے۔ اُنہوں نے کارخانوں سے سائرن مانگ لیے اور فوجیوں سے مشین گنیں، اور گولیاں برسنے لگیں۔

اور صدیوں کے مرے ہوئے بوڑھوں کی ہڈیاں بدستور پستی رہیں۔

جھنڈا بنانے والا جھنڈے کا ڈیزائن سوچتا رہا ——

کئی روز کے بعد اُس کے ملنے والوں میں سے چند لوگ اُسے ملنے آئے۔ دو ایک انجینئر تھے۔ ایک کہانی لکھتا تھا، دو فلسفے کے طالب علم تھے۔ اور ایک نے تاریخ میں ڈگری لی تھی۔ سب نے ڈیزائن کے متعلق پوچھا۔

اُس نے کہا

میں ڈیزائن نہیں بنا سکتا۔ ڈیزائن کے لیے خون کی ضرورت ہے۔ میں کمزور ہوں

مجھے زندگی سے محبت ہے۔ میں خوش رہنا چاہتا ہوں۔ میری بیوی کی آنکھیں کالی ہیں۔ وہ جب بھی محبت سے میری طرف دیکھتی ہے میرا دل لرز جاتا ہے۔ میرے بچوں کی باتیں میٹھی ہیں۔ جب میں انہیں چومتا ہوں وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ میں ڈیزائن بنا کر اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا اپنے بچوں کو بے باپ کی زندگی سونپنے سے میرا دل ڈرتا ہے —— کیا ڈیزائن قیمتی ہے؟ کیا ڈیزائن مقدس ہے؟ کیا میں اپنے بچوں اور بیوی کو موت کے سپرد کر کے صرف ڈیزائن کی خواہش کروں؟ مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ ڈیزائن خیالی نہیں ہے۔ ایک خیالی صبح جس کا چہرہ گلنار ہی ہے۔ جو اب تک نہیں آئی۔ اور شاید کبھی نہیں آئے گی۔ صبح کی باتیں چھوڑ دینا ضروری ہیں۔ میں صرف رات کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ جب میری بیوی کا سینہ تپے ہوئے تانبے کی طرح گرم ہوتا ہے۔ جب اس کا سانس دھڑکنوں میں خواب بن کر بکھر جاتا ہے۔ اور وہ فاختاؤں کی طرح میرے آغوش میں سو جاتی ہے —— زندگی اور خواب کی کشمکش فضول ہے۔ مجھے زندگی کی خواہش ہے۔ مجھے خواب کی تمناؤں سے خوف آتا ہے"

کہانی لکھنے والا حیرت سے اُس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کہا" مگر خواب کسی حقیقت کے بغیر تو پیدا نہیں ہو جاتے۔ انسانی دل کی آرزوئیں خوابوں میں اپنا منہ دیکھتی ہیں"

تاریخ کے طالب علم نے کہا

"ہم اس وقت تاریخ کے ایک نازک دوراہے پر راستوں کی تلاش کر رہے ہیں۔ یہ وقت کی ایک فیصلہ کن منزل ہے۔ جو وقت کی آواز سنتا ہے وہ وقت کو فتح کر لیتا ہے ——
تمہیں وقت کی آواز کیوں سنائی نہیں دیتی؟ جھنڈا بنانے والے نے کہا
"میں بزدل ہوں۔ میرا دل خون کھاتا ہے"
فلسفے کے پہلے طالب علم نے سنجیدگی سے کہا "کونے کا پتھر کون رکھے گا؟ اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جو ہاتھ کونے کا پتھر رکھتے ہیں وہی ہاتھ زمانے کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ اور جن ہاتھوں سے زمانہ رُخ اختیار کرتا ہے وہ ہاتھ تاریخ کے بازو ہوتے ہیں۔"
ڈیزائن بنانے والے نے جواب دیا کہ اُسے ان سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن کیا ثبوت ہے کہ جس صبح کی وہ سب آرزو کرتے ہیں وہ واقعی صبح ہوگی۔
فلسفے کے دوسرے طالب علم نے کہا کہ صبح ستاروں کی یک جہتی اور سورج کی یکساں کرنوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح جس صبح کی وہ خواہش کرتے ہیں وہ سب کی ملی جلی کوششوں سے پیدا ہوگی۔"
انجینئروں نے اس کی تائید کی اور کہا کہ خواب کو صورت بخشنا آسان نہیں ہوتا تاہم عملاً نقشے سے تعمیر ہوتی ہے۔ نئی صبح کے لئے نئی صبح کی تحریک لازمی ہے۔ اور وہ اس تحریک کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔

؟ پھر کہانی لکھنے والے نے اُس تحریک کا اعلان کیا۔

اور کہا کہ جس دن کے لیے وقت کی آنکھیں بے چین تھیں وہ وقت آچکا ہے۔ اس تحریک سے قومی بنیادیں زور آور ہوں گی۔ یہ تحریک مستقبل میں عظمتوں کا اعلان کرے گی۔

اور آنے والے دن کی خوشی میں آج پھولوں کے ہار پیش کرتی ہے!

ڈیزائن بنانے والا خوش ہو گیا۔ تو فلسفے کے طالب علم نے بڑے کاغذ پر لکھا ہوا اشتہار نکالا۔ اشتہار پر اُس تحریک کا نام لکھا تھا۔ اُس نے کہا کہ یہ تحریک مسلمانوں کی قومی اور اشتمالی تحریک کہلاتی ہے۔ اس کا جسم لوگوں کے دلوں سے پیدا ہوتا ہے اور آسمانوں کو چھو لیتا ہے۔ یہ تحریک آنسوؤں اور آہوں کو چومتی ہے۔ غمگین آوازوں کو خوشیاں واپس کرتی ہے جو ان سے چھن چکی ہیں اور چند لوگوں کی ملکیت بن چکی ہیں۔

اُنہوں نے سب سے کہا کہ نئی صبح آچکی ہے۔

کچھ دنوں کے بعد چند لوگ لاہور کے علاقے واٹر ورکس کے پاس جمع ہوئے۔ اُنہوں نے نوگزیے کی قبر کے آس پاس دکانوں کو دیکھا۔ بعض چائے کی دکانیں تھیں۔ اور کچھ جوتوں کی۔ ایک طرف کپڑے کی سلائی کرنے والا ٹیلر ماسٹر تھا۔ سڑک کے کنارے بوٹ پالش کرنے والا صبح کی کمائی گن رہا تھا۔ اور لوگ سائیکلوں، تانگوں اور موٹروں پہ آجا رہے تھے۔ لاہور کے قلعے کی دیوار اونچی اور جیسے تھی جس پہ توپیں چڑھانے کی جگہیں بنی تھیں۔

شور اور آوازوں سے زندگی کا سمندر بے پرواتھا۔

اُن میں سے ایک نے کہا "یہاں گلی میں خون کی بوندوں کا نشان ہے"

سب گلی میں چلے گئے۔

دکانوں کے نیچے لگے ہوئے تختوں پر خون کے چھینٹے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہر طرف خون کی لکیریں دکھائی دینے لگیں خون کا یہ رنگ گزرتے ہوئے راہ گیروں پر چھا گیا۔ اور ان راہ گیروں کے ہجوم میں سے ایک اُداس گروہ اُبھرنے لگا۔ وہ سب مغموم تھے۔ ان کی آنکھیں غمگین تھیں۔ اور اُن کے دلوں سے مرجھائے ہوئے پھول گرتے تھے۔ جو سڑک پر گر کر کانٹے بن جاتے تھے۔ اور جب لوگ اُن پر سے گزرتے تو اُن کانٹوں سے آنسو بن جاتے اور سڑک کے اردگرد کی گندی نالیوں میں بہنے لگتے!

دائرہ ورکس کے پاس جمع ہونے والے لوگوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"یہ اُداس گروہ کن کا ہے؟"

دوسرے نے جواب دیا "یہ وہ لوگ ہیں جو ناکام مر چکے ہیں۔ اور جنہیں کوئی یاد نہیں کرتا۔"

"ان کی موت کیوں ہوئی تھی؟ یہ سب کس لیے مرے تھے؟"

اس کا جواب اُس اُداس گروہ نے دیا۔

"ہماری موت ہماری تاریخ کے نام پر تھی۔ ہم کسی آنے والی صبح کے نام پر زندگی سے رخصت ہوئے تھے۔ مگر وہ صبح نہ ہوئی۔ اور نہ ہی ہمارے نام لوگوں کی یادداشت میں ٹھیر سکے۔ وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ خواہ خون جائز بہا ہو یا ناجائز۔ بہے ہوئے خون کا دوسرا نام گندی نالیوں کا گندہ پانی ہے"

کسی نے کہا یہ مارچ ۱۹۴۵ کا جیش ہے۔ ان ۲۱۳ آدمیوں کا گروہ جنہیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ مگر جن کی موت پُر خلوص تھی۔ جو ہمارے ہی خون اور ہمارے ہی گوشت کے بھائی تھے۔ یادداشتوں سے تاریخیں بنتی ہیں۔ اور قومیں وہی عظیم ہیں جو یادداشتوں کا ذکر کرتی ہیں۔

نئی صبح کا پیغام دینے والوں نے کہا کہ ہم انہیں یاد کریں گے۔ ہم دائٹ ورکس کے قریب ایک یادگار بنائیں گے۔ سنگ مرمر کا کتبہ جس پر یہ الفاظ ہوں گے:

"جن کا خون قیمتی تھا مگر جو پانی کی طرح ارزاں ہوا
مگر جنہیں ہم آنسوؤں کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔
وہ اس مقام پر
ہمیشہ کی زندگی پا گئے جو ہم سب کی آرزو ہے
خدا ان پر مہربان رہے!"

نئی صبح کا پیغام دینے والوں نے کہا کہ وہ صرف مسلمانوں کی قومی اور وشتمالی تحریک ہی کر سکتی ہے۔ یہ کام اُس نئی تحریک کا ہے۔ جس کی یادداشتیں تاریخ کے اوراق نے چوم رکھی ہیں۔ اور جیسے شبنم پھولوں سے خوشی کے گیت کہتی ہے وہ اپنی تاریخ سے خوشیوں کے گیت کہیں گے۔

سب نے کہا "نئی صبح کا سورج طلوع ہوتا ہے نئی صبح کا ساتھ دو!"

جھنڈے کا ڈیزائن بنانے والا دور سے نمودار ہوا۔ اُس نے سبز اور سفید رنگ کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ جس پہ نہ ستارہ تھا اور نہ ہی چاند۔ صرف ایک علامت تھی۔ دو پتیاں ایک کلی۔ کلی سرخ رنگ کے گلاب کی کلی تھی۔ جو دل سے مشابہ تھی۔ ایسا دل جس کا رنگ پیازی ہو۔ مگر یہ کلی کھل رہی تھی۔ وہ ایک مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ جیسے صبح کے طلوع ہونے کے ساتھ باغوں میں پھولوں کے چہرے مسکرا اُٹھتے ہیں۔ اس کلی کو اُٹھائے ہوئے دو پتیاں تھیں جیسے دعا کو اُٹھی ہوئی باہیں ——!

ٹوپی والا

کوہالہ کے پُل پر سے گزر کر اگر آپ دائیں طرف چلنا شروع کر دیں تو آپ آزاد کشمیر کے علاقے میں ہوں گے۔ کچھ ٹوٹی ہوئی لاریاں، گندے اور بدحال مزدور قسم کے شریف آدمی، بدبودار چائے کی دکانیں، اور پھولے ہوئے پیٹ کے ٹھیکیدار، ان مختلف اجزاء سے آزاد کشمیر کا دردناک اور بدصورت چہرا پیدا ہوتا ہے۔ پونچھ ٹرانسپورٹ اور مارخ موٹر سروس دونوں سروسیں بے کار ہیں۔ ان کا وقت محشر کی طرح کبھی مقرر نہیں ہوتا۔ اور ان کا سفر مسافر کے لیے "غالباً" زندگی کا آخری سفر بھی ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے میدانوں سے آئے ہوئے لوگ صرف ایک بار آزاد کشمیر آتے ہیں اور جب لوٹتے ہیں تو اپنے خانے والے کا شکر ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور آزاد کشمیر اس کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ایک ہے۔

میں ان دنوں دھیر کوٹ میں گرمی کی چھٹیاں گزار رہا تھا۔ یہ اُداس، خاموش اور سست وضع کی بستی گزرتی ہوئی سڑک کے کنارے عموماً سوئی رہتی ہے۔ جب موٹر رک جاتی ہے یہ بستی بھی جاگ اُٹھتی ہے۔ اور بستی کے جاگنے کے ساتھ اس کا ہائی اسکول، تھانہ، ولی داد کی دکان، کپڑے کی دکان جس میں ڈاک خانہ ہے اور سکول کے چپڑاسی روشن کی آنکھیں سب چیزیں ایک لمحہ کے لئے جاگ اُٹھتی ہیں۔ یہ پنجاب ٹرانسپورٹ کی لاری رکتی ہے۔ مسافر اُترتے ہیں لاری چلی جاتی ہے اور بستی پھر اونگھنے لگتی ہے۔ یہ دھیر کوٹ کی روحانی وضع قطع ہے۔ اور اسی وضع قطع میں میں نے زندگی کے کچھ اداس دن گزارے ہیں!

یہاں جنگلی پھولوں کی تلاش بے سود ہے کیونکہ یہاں پھول نہیں اُگتے کانٹے اگتے ہیں۔ رومان کی تلاش بھی عبث ہے کیونکہ یہاں رومان کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ اور مسکراہٹوں کی طلب بھی فضول ہے کیونکہ یہاں سب کے ہونٹ فاقوں سے غمگین رہتے ہیں۔ فاقے، غربت، افسردگی انسانی دنیا کا آسمان ہے مگر آسمان کا رنگ ایڈنبرا کی خوبصورت لڑکیوں کی آنکھوں کی طرح نیلا ہے۔ پہاڑیوں پر ریشم کی نقابیں اُڑتی ہیں۔ اور دُور دُور نقرئی پانیوں کی ندی خواب میں ناچنے والی کافر لڑکیوں کی طرح خموش بہتی رہتی ہے۔ اس عجیب و غریب دنیا میں مجھے دو چہرے خاص طور پر پسند آئے، کرسچین ورلڈ

کہ دسیڈ کا متنفری سٹرڈ ادبی شاعر اور چوبارے میں رہنے والا پردیسی جس کا نام کسی کو معلوم نہ تھا۔ سب اُسے ٹوپی والا کہتے تھے، مگر وہ ٹوپی نہیں عینک پہنتا تھا۔ اور حیرت یہ ہے کہ دھیر کوٹ میں سب لوگ ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ اُسے ٹوپی والا اس لیے کہتے تھے کیونکہ اُسے ٹوپی پہننا چاہیے تھی۔ تو وہ اُس چوبارے میں ٹھیرا تھا۔ جسے فضل داد کی دکان شب بسری کے طور پر استعمال کرتی تھی —— میں جب دھیر کوٹ پہنچا۔ اُس وقت وہ چوبارہ ابھی خالی تھا۔ اُس کی قطع تراش سنسنی خیز تھی۔ لکڑی کا بنا ہوا صندوق نما کمرہ جیسے ریل گاڑی کا ڈبہ ہو۔ اس کمرے میں جانے کے لیے لکڑی کی سیڑھی تھی جو تہ خانوں کے ذینوں کی طرح کمرے کے چوبی فرش میں کھلتی تھی۔ چوبی فرش کا یہ حصہ دوسرے لفظوں میں اس کمرے کا دروازہ تھا۔ کمرے کے سامنے ایک چھوٹی سی بالکنی تھی۔ چھت ٹین کی تھی جو برسات میں خواہ مخواہ جل ترنگ بجاتی تھی۔ اپنے قیام کے پہلے ہفتے میں میں یہاں مدعو تھا اور یوسف نے چائے کی دعوت دی تھی۔ یوسف پانچویں سے نویں جماعت تک انگریزی پڑھاتا تھا۔ اور ساتویں سے نویں تک تاریخ جغرافیہ اُس کے ذمے تھا۔ اور بھی بہت سے لڑکے اور ٹیچر موجود تھے —— غالباً آپ نے آزاد کشمیر کے لوگوں کی ایک خاصیت پہ کبھی غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے کہ وہ فطرتاً انقلاب پسند واقع ہوئے ہیں۔ اگر اُن کے کردار کا اندازہ نہ کیا جائے تو مجھے

یقین ہے کہ روسی افسانہ نگار دوستو فسکی کے انقلابی اور آزاد کشمیر کے طالب علم آپس میں بہت مشابہ دکھائی دیں گے اور حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد آزاد کشمیر کا طرزِ فکر بھی سیاسی ہو چکا ہے جو میرے بچپن کے زمانے میں مذہبی ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں ہم نماز پڑھا کرتے تھے۔ نعتیں پڑھتے تھے اور غارِ حرا کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اب صورت اور تھی۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پہ باتیں کرنے کی بجائے موضوع آزاد کشمیر کی حکومت تھا۔

گلزار خاں کا کہنا تھا کہ آزاد کشمیر کی حکومت حقیقتاً غلاموں کی حکومت ہے۔ کیونکہ اس کی اپنی کوئی بھی مرضی نہیں ہے۔ سب احکام اُسمان سے آتے ہیں۔ اور آزاد کشمیر کے وزیر اُن احکام پر انگوٹھا لگا دیتے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک نے کہا کہ جب شاہ صاحب وزیر تھے۔ اُس وقت جب انہیں سب سے پہلے حکم نامے پر دستخط کرنے کو کہا گیا تو وہ بوٹ کے تسمے کھولنے لگے۔ ان کے خیال میں انگوٹھے سے مراد پاؤں کا انگوٹھا تھا۔

آپ ان باتوں سے یہ نہ سمجھیں کہ آزاد کشمیر کے لوگ ریاست کے تصور اور حکومت کے عہدہ داروں میں تمیز نہیں کر سکتے۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر جو چیز اُن کی سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ قربانی دینے سے اچھائی پیدا ہونی چاہیے مگر آزاد کشمیر میں ہر طرف

جدائی پیدا ہو رہی تھی۔ کیا اُن کا دبا ہوا خون گندے پانی کی طرح بدبودار نہ تھا جس سے صرف بدبودار طبیعتوں کے عہدہ دار پیدا ہوئے تھے۔ یہ انداز فکر ان کے مذہبی پس منظر کے باعث ہے۔ کہ صالح کردار سے صالح حکومت پیدا ہوتی ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں جماعت اسلامی کا دعویٰ یہی ہے!

اشرف حسین کو اپنے محکمہ کے ڈائرکٹر سے شکایت تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اس ڈائرکٹر میں اور ڈوگرہ حکومت کے افسروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اپنی تائید میں وہ چین کی عوامی حکومت کا ذکر کرتا تھا۔ مگر ماؤ کی حکومت کے قطع نظر اشرف حسین کا کہنا یہ تھا کہ بینڈ باجوں اور جھنڈیوں کے جلوس سے تعلیم پیدا نہیں ہوتی۔ اور ڈائرکٹر کو اپنی سلامی لینے میں مزا آتا ہے۔ جب وہ ہاڑی گیل کے مدرسے کا معائنہ کر رہا تھا۔ تو سکول کے ہیڈ ماسٹر نے اُسے ایک سو ایک گولوں کی سلامی دی تھی۔ اور جو سپاسنامہ پڑھا تھا اُس میں شہنشاہی دور کے القاب تھے "حضور فیض گنجور" عالی جناب، صاحب ڈائرکٹر بہادر" یہ خیریت گذری کہ وہ سپاسنامہ لکھتے وقت "ظل سبحانی" لکھنا بھول گیا تھا — جب ڈائرکٹر واپس چلا گیا تو ہیڈ ماسٹر نے سکول لاگ بک میں اندراج دیکھا "سکول کا انتظام ناقص ہے۔ ہیڈ ماسٹر کند ذہن ہے، لڑکوں کا چال چلن خراب ہے" اُس وقت ہیڈ ماسٹر نے نہایت غمگین لہجے میں کہا "کاش کہ میں ظل سبحانی

"لکھنا نہ بھولنا"۔ اور نو اور دہ میری بندوق بھی لے گیا ہے، اس ڈائرکٹر سے تو ڈوگرہ حکومت کا چیف فتح خاں اچھا تھا۔ رشوت لیتا تھا مگر رپورٹ تو موافق لکھتا تھا۔"

آزاد کشمیر کا طرزِ فکر انقلاب اور تعمیر کے گرد گھومتا ہے۔ مگر ناکام ہونے والے انقلاب کی طرح یہاں بھی نامرادی ہے اور منفی قسم کی صورتِ حال شاید اسی وجہ سے ہے"

ہم نے بہت کچھ سنا اور بہت کچھ کہا۔ اور آخر میں یہ مشورہ دیا کہ حالات یوں درست ہوں گے۔ حکومت عوام کا حق ہے اور افراد کی برتری اس حق کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ انقلاب عموماً عوام کی مرضی سے رونما ہوتا ہے۔ اور جب انقلاب کامیاب ہوتا ہے اس کے عہدہ دار نقص رجعت پسند عہدہ داروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ شہنشاہی دور کے عہدہ دار گلابی یونین جیک کے پیلے پتوں کی مانند بیمار ہیں۔ اور مصیبت یہ ہے کہ یہ بیمار پتے بہار کے نئے پودوں کو کھلنے نہیں دیتے۔ کیا ہم بہار نہیں چاہتے؟ کیا ہماری قسمت میں زردیاں لکھی ہیں؟ کیا ہمیں غلامی اور آزادی کا فرق نہیں؟ رجعت پسند عناصر کا خاتمہ ضروری ہے!

اور اس خاتمے کے لئے ایک یونین کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ یونین استادوں اور لڑکوں سے قوت حاصل کرے گی۔ اور نئے دن کی خوشخبری دے گی۔ کالی راتوں کے صدموں کا اندمال کرے گی۔

"گزرا ہوا دن" ـ مردہ باد "نیا دن" زندہ باد!

"قومی تحریک کا ساتھ دو"

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ یہ چوبارہ لکڑی کا اداس کمرہ نہیں ہے بلکہ نئی خوشخبریوں کی قیام گاہ ہے۔

اُسی شام میری ملاقات ورلڈ کروسیڈ کے مشنری مسٹر ڈاڈ بی شائر سے ہوئی:

ڈاڈ بی شائر مشنری تھا۔ اور مشنریوں کی مانند اُس کا ذہن نوک تنگ اور خطِ مستقیم کی مانند واضح تھا۔ اُسے صرف باپ، بیٹا اور روح القدس کے الفاظ آتے تھے۔ تبلیغ کرنے سے پہلے وہ دوسری جنگ عظیم میں بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ اور لکڑیوں کے ڈبے بنایا کرتا تھا جس میں برمنگھم کی بی ایس اے کمپنی کارتوس پیک کیا کرتی تھی۔ جب جنگ رُکی تو اُسے محسوس ہوا کہ یسوع اُسے آواز دے رہا ہے۔ اور وہ مسیح کی آواز اور بلاوا رد نہ کرسکا۔ اُس کے ورلڈ کروسیڈ میں شامل کی وجہ یہی تھی ——— اُس کے پاس ایک گراموفون تھا۔ اور بہت سے ریکارڈ تھے۔ اُس کے کمرے کی دیواریں اس قسم کے اشتہاروں سے مزین تھیں "اے بوجھ سے تھکے ماندے لوگو! میں تمہیں آرام دوں گا" "ہمارے گناہ سرخ دوشالے کی طرح چمکدار ہیں" "وہ مبارک ہیں وہ لوگ جو غریب ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہت ان ہی کی ہے" وغیرہ وغیرہ،

میں نے اُس سے کہا "عیسائیت ایک عظیم مذہب ہے"

اُس نے جواب میں گراموفون پہ ایک ریکارڈ چڑھا دیا۔ جو مخصوص نفرکا دینے والی آواز میں بجنے لگا۔

"یسوع مسیح کا نام لو، اُس کی عبادت کرو، وہ ہمارا نجات دہندہ ہے۔ وہ ہماری اُمید ہے۔ آمین!"

اُس نے پیڈنٹ لہجے میں کہا "کیا میں عیسائی ہونا پسند نہ کروں گا؟"

میں نے جواب میں کہا کہ میں نے تبدیلی مذہب پر کبھی غور نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مجھے خدا کی ضرورت پر شک رہا ہے اور جب خدا ہی مشکوک ہو تو مذاہب کا مفہوم باقی نہیں رہتا۔ کیا خدا ہے بھی؟ یا محض ایک نام ہے جیسے سچائی، انقلاب اور دوسرے بہت سے تصورات ہیں۔"

مشنری نے کہا خدا ایک احساس ہے۔ اور جب یہ احساس گہرا ہوتا ہے اُس سے ایمان پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ایمان یسوع کا احسان ہے ع شک کی راہیں ہلاکت کو پہنچاتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے دل سے پوچھیں کہ وہ کون ہے میں جس کا بیمار ہوں؛ اے میری روح کی چھپی ہوئی راحت! میرے قریب آ اور مجھے اپنے آغوش میں لے کہ میں ہجر اور جدائی سے نحیف ہوں، یسوع! میرے دل میں اُتر! میرے دل میں اُتر اے سچائی کی عالمگیر آواز، مجھے راستہ دکھا کہ اندھیرے میں چاروں طرف ہیں اور میرا دل خوف سے کانپتا ہے۔

اُس وقت میں نے سوچا کہ مشنری کی آواز اور آزاد کشمیر کی آواز ایک ہیں۔ مشنری

خدا کو آواز دیتا ہے۔ اور شاید اُسے خدا کا علم بھی نہیں۔ وہ صرف یسوع کو جانتا ہے۔ اُس یسوع کو جسے ایڈنبرا کا دینیاتی کالج پیش کرتا ہے۔ یوسف نجار کے اسرائیلی بیٹے کی یورپی اختراع۔ اسی طرح آزاد کشمیر بھی اپنی چھنی ہوئی روح کو پکارتا ہے۔ مگر اُس روح کو پہچاننے والی آنکھیں نہیں ہیں۔ نہ ہی پاکستان میں آنکھیں دیکھنے کی عادی ہیں اور نہ ہی ان پہاڑوں میں وہ نظر موجود ہے اسلام کا خدا انسانی تاریخ میں سب خداؤں سے زیادہ مجبور ہے۔ اُس کے ہاتھ اور پاؤں زنجیروں سے بندھے ہیں۔ وہ بولنا چاہتا ہے مگر اُس کی آواز گھٹی ہوئی ہے۔ اور مسلمانوں کا محبوب پیغمبر زخمی ہے۔ وہ زخمی ہے کیونکہ جو اُس کی آواز پر فریفتہ ہیں وہ زخمی ہیں اس خدا اور اس پیغمبر کی دنیا میں آنسو بہتے ہیں۔ کرب اور کراہوں کی پکار اٹھتی ہے اور موت کا خطرناک سایہ ناچتا ہے۔

مشنری نے کہا کہ یسوع نے صرف ایک بار آواز دی تھی۔ مگر اسلام کا پیغمبر صبح و شام دعائیں کرتا تھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ یسوع صلیب پر مر گیا اور اسلامی پیغمبر کو کامیابی ہوئی۔ مگر مذاہب کا موازنہ دیرپا نتیجوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اُس ایک آواز کے باعث یورپی دنیا آسائش سے ہے، اور متواتر دعاؤں سے چاند اور ستارے کا دل مردہ ہے، آج عربی پیغمبر کی دنیا میں بھوک اور موت رہتی ہے۔ اور یسوع

کی دنیا میں خوشبوؤں کے سورج طلوع ہیں! کیا یہ آواز دل ہلا دینے والی آواز نہیں ہے" "اے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟"

میں نے کہا "تو کیا ہمارا خدا ہمیں چھوڑ چکا ہے؟"

ڈاکٹر بی شناگر نے جواب دیا "آزاد کشمیر کی زمین اس کا جواب دے گی، پاکستان کے پاس یہی جواب ہے۔ اور یہی جواب مشرق وسطیٰ کے عرب ملکوں کا ہے، اسلام کا خدا انہیں چھوڑ چکا ہے۔ اس کی موت واقع ہو چکی ہے۔ تم سب کا آسرا ٹوٹ چکا ہے۔ یہ دورِ ماتم کا دور ہے، بچھڑے ہوئے خدا کی تلاش کرو"

اور جب میں واپس آ رہا تھا ایک عجیب قسم کی اداسی چھا چکی تھی۔ ہمیں خدا بھی چھوڑ چکا ہے۔ ہمارا محبوب پیغمبر زخموں سے لاچار ہے۔ آزاد کشمیر کا انقلاب ناکام ہو چکا ہے۔ پہاڑیاں بیوگی سے ہیں۔ اے زندگی کی روح! نیا دن کب طلوع ہو گا ـــ" جب میں چوبارے کے پاس سے گزرا تو فضل داد نے بتایا کہ چوبارہ تین ماہ کے لئے کرائے پر چڑھ گیا ہے۔

دھیر کوٹ ہائی سکول کے برآمدے میں ہیڈ ماسٹر صاحب بیٹھے تھے۔ اُن کا اندازِ نشست وہی تھا۔ آرام دہ کرسی، حقہ اور راولپنڈی سے شائع ہونے والا روزنامہ تعمیر۔ اُن کے چہرے پر ایک مخصوص کیفیت تھی جو زندگی کو دیکھ دیکھ

کو پہچاننے کی عادی ہو چکی تھی۔

اس شام وہ کچھ خاموش تھے۔ اُن کے بڑے لڑکے نے مظفر آباد سے آنا تھا۔ اور لاری کہیں راستے میں خراب ہو گئی تھی۔ گو وہ دل میں مضطرب ضرور تھے تاہم ان کی آنکھوں میں وہی نہ بدلنے والا احساس تھا "وقت کا انتظار کرو" اور جب وہ اس کیفیت سے دوچار ہوتے تھے کہ "وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا" اُس وقت بھی یہ گہری اور چبھنے والی آنکھیں یہی کہتی تھیں، انتظار کرو! وقت کا انتظار کرو!" سکول کی عمارت دھیرکوٹ کا مرکزی نقطہ تھی۔ یہ مرکزیت صرف دھیرکوٹ ہی سے منسوب نہیں بلکہ آزاد کشمیر کا اخلاقی کردار ہے۔ سکول کی عمارت آزاد کشمیر کے روحانی تقاضوں کی مظہر ہوتی ہے۔ مگر یہ صورت حال پاکستان بننے سے پہلے تھی۔ اور آزاد کشمیر کے انقلاب کی ناکامی کے بعد بدل چکی ہے۔ اب سکول کی عمارت مرکزی نہیں تھانے کی عمارت ہر لحاظ سے مرکزی ہے اور تھانے دار ہیڈ ماسٹر سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ لوگ اب علم کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر ان بدلتے ہوئے حالات کا اثر دھیرکوٹ پر ابھی کم تھا۔ سکول کا احترام اُسی طرح کیا جاتا تھا گو چند لوگ ایسے تھے جو ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ اور پاکستان میں ترقی پسندی کا مطلب علم اور اخلاق کی تذلیل ہوتی ہے۔ تاہم وقت آہستہ آہستہ گذر رہا تھا۔ اور

ہیڈ ماسٹر صاحب برآمدے میں خموش بیٹھے تھے۔

ایک ایک کرکے لوگ آنے لگے۔ شام کی مجلس سکول میں ہوتی تھی فارسی اور عربی کے مولوی صاحب، حساب کے اُستاد، انگریزی اور تاریخ جغرافیہ کا ٹیچر یوسف، پرائمری کو پڑھانے والے خلیل صاحب، ان کے علاوہ ٹھیکیدار صاحب بھی آگئے۔ کچھ طالب علم بھی ادھر اُدھر سے گھومتے ہوئے بالآخر بنچوں پر آ بیٹھے تھے۔ ان میں منیر نمایاں تھا۔ گوجرانوالے کا رہنے والا۔ وہاں اُسے دق ہو گئی تھی۔ ساملی کے سینیٹوریم نے اُسے داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور جن دنوں عبدالرب نشتر گورنر تھے اُس نے اُنہیں ایک ذاتی خط لکھا تھا کہ یا تو گوجرانوالے میں حفظانِ صحت کا انتظام کیا جائے یا اُسے خودکشی کی اجازت دی جائے۔ گورنر نے اُسے ساملی میں داخل کروا دیا اور اب وہ صحت یاب تھا۔ وہ یہیں کوٹ میں کچھ دنوں کے لیے ٹھیرا تھا تاکہ میدانوں میں واپس جانے سے پہلے اچھی طرح تندرست ہو جائے! اس مجلس کی ایک خوبی یہ ہوا کرتی تھی کہ بزرگ باتیں کرتے تھے اور لڑکے ان کی باتیں سنتے تھے۔ گفتگو ہر موضوع پہ ہوتی تھی۔ مذہب، سیرت نبی، تذکرۃ الاولیاء، آزاد کشمیر اور رائے شماری کی ضرورت! مگر اس وقت سب چپ تھے۔ البتہ ٹھیکیدار صاحب گندم کا ذکر کر رہے تھے

کہ گندم کا بھاؤ چڑھ رہا ہے اور پنجاب سے اگلے چھ ماہ کی گندم ابھی تک نہیں آئی۔ اگر حالات یونہی رہے تو قحط پڑ جائے گا۔ فارسی کے استاد کا کہنا تھا کہ جنس تو سرے سے نایاب ہے۔ نہ چاول ملتا ہے نہ آٹا اور نہ ہی دال کا دانہ دکھائی دیتا ہے۔ کپڑے کی بھی تنگی ہے۔ اس موقعہ پہ منیر سے رہا نہ گیا وہ بول اٹھا۔

"مگر ولی داد تو ہر روز مرغا پکاتا ہے۔"

یوسف نے کہا

"اس نے مرغے مرغیاں پال رکھی ہیں۔ اسے تو سب مال مفت مل جاتا ہے مگر دوا ایک بوٹیاں جو ہم کھا لیتے ہیں اس کے پیسے لکھنے میں وہ کبھی دیر نہیں کرتا۔۔۔ کہتا ہے استادوں کے ذمے اس کے پانچ سو ہو چکے ہیں"

سب استاد چونک اٹھے

"جی ہاں، مگر وہ بڑا چالاک ہے۔ کہتا ہے جب مظفر آباد سے بل پاس ہو کر آئیں گے اس وقت آؤں گا۔"

"خلیل صاحب" ہیڈ ماسٹر نے کہا "تنخواہوں کے بل کب آئیں گے؟"

خلیل صاحب سکول کے کلرک بھی تھے اور اُستاد بھی

"جی" پلے تو آچکے ہیں مگر خزانہ ابھی نہیں آیا"

آزاد کشمیر کا خزانہ راولپنڈی سے آتا تھا۔ نہ راولپنڈی سے مظفر آباد جاتا تھا۔ مظفر آباد سے باغ اور پلندری، اور باغ اور پلندری جانے کے بعد دوسری جگہوں میں پہنچتا تھا۔ دھیر کوٹ باغ اور مظفر آباد کے راستے میں تھا مگر قاعدے کی خلاف ورزی ناممکن تھی۔ اس لیئے تنخواہیں بعض دفعہ چھ مہینوں کے بعد ملتی تھیں اور بعض دفعہ خزانہ راولپنڈی ہی سے روانہ نہ ہوتا تھا۔ لوگوں کی نظریں خزانے کی بجائے خزانہ لانے والی لاری کے پہیوں پر رہتی تھیں۔ وہ ہر روز پہاڑوں پر گذرتی ہوئی پتلی سڑک کو دیکھتے۔ دل داد انہیں دیکھتا۔ اور سڑک اُن کا منہ چڑاتی رہتی تھی!

لاری کی گھوں گھوں سنائی دی۔ روشنی سرچ لائٹ کی طرح چوبارے پر پڑی۔ پونچھ پل ٹرانسپورٹ کی نمبر ایک بس ۱۵۰۲ آگئی۔ کچھ مسافر اُترے۔ باغ کی عدالت کا منشی، ہیڈ ماسٹر صاحب کا بڑا لڑکا اور راولاکوٹ جاتا ہوا محمد خان وکیل۔ ان کے ساتھ مسلم کانفرنس کا پراپیگنڈا سیکرٹری منظور الہٰی بیکس بھی تھا۔

سب کے سب سکول کے برآمدے میں آگئے۔ ایک لڑکے سے کہا گیا کہ وہ دل داد سے کہے کہ چار کھانے لے آئے۔

چھوٹی چھوٹی بستیوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہاں اخباروں کی بجائے زبانی خبروں کا زیادہ چرچا ہوتا ہے۔ وہ چھپے ہوئے الفاظ کی بجائے سُنے ہوئے الفاظ پر زیادہ یقین کرتی ہیں۔ ان باتوں میں ایک طرح کی ڈرامائیت بھی ہے۔ انسان انسان دکھائی دیتے ہیں اصطلاح نہیں بنتے ——— مگر سب ایک ہی خبر لائے تھے۔

مظفرآباد کا جلسہ!

انہوں نے کہا کہ محکمہ تشکیل اسلام پنجاب کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا۔ جس کی صدارت وزارتِ امورِ کشمیر کے انڈر سکریٹری نے کی۔ لیکچر مولانا عبدالقدیر انجم کا تھا۔ اور موضوع تھا "کمیونزم اور مسلمان"

چھوٹی عمر کے اُستاد اور طالب علم توجہ سے سننے لگے۔

بیکس صاحب نے کہا کہ تقریر لاجواب تھی۔ اور مولانا نے ثابت کیا کہ اسلام قیامت تک کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ کمیونزم دھوکا ہے اور کفر سکھاتا ہے۔ بے دینی کی تلقین کرتا ہے،

منشی صاحب نے کہا "اور کہ ——— کہتا ہے کہ خدا نہیں ہے"

سب یکبار چلا اٹھے نعوذ باللہ!

اس موقعہ پر ہیڈ ماسٹر صاحب کے بڑے لڑکے نے کہا "مگر ہم اس طرح کمیونزم کو روک

بھی تو نہیں سکتے۔ کمیونزم خیالی باتوں کا انکار ضرور کرتا ہے مگر اصلیت کو چھپاتا بھی تو نہیں۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ بھوک خدا کی محبت سے زیادہ طاقتور ہے"

مجلس میں ہلچل پڑ گئی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "سوال یہ نہیں کہ بھوک طاقتور ہے یا خدا۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا ہمیں خدا سے محبت ہے! اگر ہم خدا کو چاہتے ہیں تو بھوک ہمارا راستہ نہیں روک سکتی ــــ"

یوسف بولا " مگر جناب، اگر سب کے سب مسلمان فاقوں سے مر جائیں تو پھر خدا کو کون یاد کرے گا۔ کمیونزم تو خدا کا انکار کرتا ہے۔ مگر مرنے والے تو مسلمان ہوں گے۔ پھر تو ساری دنیا کمیونسٹ ہو جائے گی۔ ۔ ۔ ۔"

بات کاٹتے ہوئے منشی صاحب نے کہا "مجھے حضرت مسیح موعود کا الہام یاد آتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیان بر منارِ بلند تر محکم افتاد! اب اسلام کا سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور ساری دنیا مسلمان ہو جائے گی۔ چودھویں صدی کے مجدد کی یہی خوشخبری ہے"

ولی داد چار آدمیوں کا کھانا لے کر آ گیا۔ ... نے کہا کہ فضل داد کے چوبارے میں جو شخص ٹھہرا ہے وہ سی آئی ڈی معلوم ہوتا ہے۔ وہ گوشت نہیں کھاتا۔ خالص دہی مانگتا ہے۔

فضل داد نے کہا کہ یہاں وہی نہیں ملتا تو وہ بڑبڑانے لگا وہ "درمیان" کو "بھیتر" بولتا ہے۔ اور پوچھتا ہے کہ منگ ٹاٹے پہ جو کیمپ ہے اُس میں کتنے فوجی ہیں، احمد خان سپاہی کا خیال ہے وہ ہندوستان کا جاسوس ہے۔

جاسوس پہ سب کے کان کھڑے ہو گئے اور سب چوباوے کی طرف دیکھنے لگے۔

ولی داد کے جانے کے بعد مجلس برخواست ہونے لگی۔ حقے پر دوبارہ کوئلے رکھے گئے، تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے لڑکے سے پوچھا کہ مظفر آباد میں خزانہ پہنچا ہے کہ نہیں؟ اُس نے کہا کہ امورِ کشمیر کی وزارت کا آزاد کشمیر کی حکومت سے کچھ تنازعہ ہو گیا ہے اور شاید خزانہ آنے میں اور دو مہینے لگ جائیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب حقہ پینے لگے۔ اور نیند دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ اُترنے لگی۔

میں جو بات اب بتاؤں گا وہ عجیب و غریب ہے — اُن دنوں آزاد کشمیر میں چار طرح کی سی آئی ڈی تھی۔ اور تین طرح کی پولیس۔ مقامی پولیس، پنجاب پولیس اور پنجاب پولیس کے ساتھ بارڈر پولیس اور ان کے ارد گرد ملٹری پولیس۔ ان کی سرگرمیاں متوازی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی خبر گیری کرتے تھے۔ اور اس طرح محکمہ سراغ رسانی کا ایک انوکھا گورکھ دھندا بن جاتا تھا جو بعض دفعہ مقامی لوگوں ہی کو تختۂ مشق بنا لیتا

تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کشمیر کی آب و ہوا میں سپاہیوں کی بُو ہے۔ ہر درخت کے کان ہیں اور ہر دیوار کے پیچھے ملٹری پولیس موجود ہے۔ ایسا بھی اتفاق ہوتا تھا کہ بستی میں عام لوگوں سے زیادہ پولیس پھرتی نظر آتی تھی۔ مگر شکاری کتوں کی طرح جو ایک عرصے سے شکار نہ کر سکے ہوں پولیس کے یہ سارے کاڈر یا مفتوح ہو چکے تھے۔ عام لوگوں کے ساتھ چائے پیتے تھے اور بعض پنجابی کانسٹیبل شلوار بھی چڑھانے لگے تھے۔ پہاڑی کے ایک طرف ان کا کیمپ تھا۔ جہاں سفید خیمے تھے۔ اور پتھروں پر سفیدی کی گئی تھی۔ رات کے وقت وہ آگ جلا لیتے اور کبھی کبھی اونچی آواز میں گاتے ؎

؎ سیف ملوک پری نال بیٹھے۔ نال محبت دل دی اے اے اے
(ا نے) جس دی چیز نوں ڈھونڈن چلے سے تے اوڑک اک دن مل دی اے لے
لے لے۔۔۔۔ اے

اور کبھی ؎ سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ عیش بہاراں
سدا نہ حسن جوانی رہندی سدا نہ صحبت یاراں

اور جب آسمان پر چاند نکلتا۔

؎ باغاں دے وچ بلبل بولے تے کسیاں بولن پانی

جنہاں اساڈے سجن وچھوڑے صبر انہاں دی جانی

جب سے کشمیر کی لڑائی بند ہوئی تھی اور آزاد اور غلام کشمیر کی عارضی سرحد مقرر ہوئی تھی۔ فوجیوں اور سپاہیوں کی زندگی آرام دہ ہو رہی تھی رہنگ ناڑے کا کیمپ جو فوجی کیمپ تھا جس میں ۸ پنجاب کی ایک رجمنٹ مقیم تھی اب تفریح کرنے والوں کا کیمپ بن چکا تھا جمعدار اور صوبے دار کے خیموں میں وائرلیس بجتے تھے۔ جن پہ آزاد کشمیر ریڈیو اور ریڈیو پاکستان لاہور کی فرمائشیں سنی جاتی تھیں۔ فوجیوں نے ناڑے کے ایک طرف حوض بھی بنا لیا تھا جہاں وہ کپڑے دھوتے تھے۔ کبھی کبھی اُن کے دوسرے گذرتے ہوئے فوجی دوست بھی آجاتے اور ان خیموں میں قہقہوں کی آواز سنائی دیتی۔

مگر آدمی خواہ فوجی ہو خواہ پولیس کا سپاہی ہو آخر آدمی ہوتا ہے۔ اور آدمی تنہائی سے گھبرا جاتا ہے۔ اس لیے جب وہ تنہائی اور قواعد اور قاعدے سے گھبرا جاتے تو دھیر کوٹ کے "ہوٹلوں" اور "چائے خانوں" میں چلے آتے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے اُن کی ملاقات ان دکانوں پر کام کرتے ہوئے لڑکوں سے ہوئی۔ چائے کی دکانوں پہ کام کرتے ہوئے لڑکے عموماً پیارے اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ نوعمر اور ناتجربہ کار اور پہاڑ کے رہنے والے اس

لئے ان کا رنگ گورا بھی ہوتا ہے۔ مجھے یہ ولایت آکر معلوم ہوا ہے کہ جو کام یہاں کی لڑکیاں سر انجام دیتی ہیں وہ پردہ نشین ملکوں میں ان لڑکوں کے ذمے ہوتا ہے۔ وہ اُن کے دوست ہوتے ہیں۔ ان کے ہمراز اور ان کی تنہائیوں کے ساتھی، پردیس بڑی مصیبت ہے اس لئے پردیس کی محبت بھی بڑی ظالم ہوتی ہے — اور کشمیر کی لڑائی بند ہونے کے بعد ان فوجیوں اور سپاہیوں کے دل جذبات کی جنگ آزمائیوں میں مصروف ہو گئے اور ان دکانوں کی میلی بنچوں کے آس پاس محبتوں، رومانوں، وعدوں اور خطوں کے سلسلے بننے لگے۔

اور جب آسمان نیلا اور ستاروں کا رنگ سندن سار کی مانند پاکیزہ ہوتا۔ صنوبر کے درخت ایرانی معشوق کی طرح سرو قد قطار باندھے اور نیلم کی نقابیں دور پہاڑیوں پر پھیل جائیں — جب فوجیوں ——— اور سپاہیوں کے دل غمگین ہوتے۔ ہزارا، کیمبل پور اور جہلم کی یاد آتی، اور جب انہیں خون کی تیزی میں دل کی دھڑکن بے چین کرتی، اور دھیر کوٹ کی آنکھوں میں چاندنی پیار بن کر سو جاتی ——— اُس وقت وہ نہ سی آئی ڈی کر سکتے، نہ انہیں قواعد اور قاعدے کا فکر ہوتا۔ وہ انسان بن جاتے اور انسان محبت کے ہاتھ میں ننھا سا کھلونا ہے!

اور اس کھلونے سے کھیلتی ہوئی راتیں سنبھل سنبھل کر گذرتیں۔
اُنہی دنوں کیمپ کے کچھ فوجیوں کا تبادلہ ہو گیا۔ انہیں ہیڈکوارٹر جانے کا حکم ملا۔ اس سے نہ صرف کیمپ میں ہلچل مچ گئی بلکہ دھرکوٹ کا دل بھی دھڑکنے لگا۔ چائے کے کپ پکڑاتے ہوئے ملازم لڑکوں کے ہاتھ کانپنے لگے۔ چولہے کے پاس ان کی آنکھیں چپ چپ روتیں۔ بعض اور اپنی قمیص کی جیب سے فوجی دوستوں کی تصویر نکال لیتے اور دیکھتے اور دیکھتے رہتے۔ کبھی اُسے چوم لیتے اور کبھی آنکھوں سے لگا لیتے۔ سسکیاں، محبتیں، دھڑکن سب کی گونج اُٹھی اور شاعری بن گئی۔ آزاد کشمیر کی آب و ہوا شعر و شاعری کی دھڑکنوں سے ویسے بھی معمور ہے۔ مگر تجربے کی دھڑکن تو سراسر منفرد چیز ہوتی ہے۔

لاریوں کا کانوائے آیا۔ بعض خیمے اکھڑے۔ آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ بعض فوجیوں نے رخصت کے سلام کیے۔ اور کانوائے سڑک پر سرکنے لگا۔ چیل کے درختوں میں نیلی آنکھوں والے لڑکوں کی نگاہیں انہیں دور تک پیار بھیجتی رہیں۔ پہاڑ کی محبت چٹانوں کی مانند پختہ ہوتی ہے اور بلندیوں کی مانند بے لوث! اور جب بھی رات کا جسم خواب ناک ہوتا۔ محبتوں کا دکھ اداس گیت اور جوانی کی چبھن اندوہگین ہوتی اس سڑک کے کنارے اُونگھتی ہوئی بستی کا دل فاختاؤں کی چیخ بن جاتا۔ اور ایسے

گیت سنائی دیتے۔

؎ سجن ملسی کہ نہ ملسی۔ ملن ہوسی کہ نہ ہوسی

اور کہیں دور سے سہما ہوا غمگین دوہا اس کا جواب دیتا،

؎ قرب نہ سانوں مول ہویا لہے۔ سیم تو میلوں دور اے اے

(انے) نوکر رہساں یار دے ور دا رشتا لا عرض کریں منظور اے اے

اور پہاڑیاں گیتوں پہ سر رکھ کے سو جاتیں!

رفتہ رفتہ دکانوں پر جنس کم ہوتی گئی۔ چاول کی بوریاں خالی ہو گئیں۔ چنے کی دال ختم ہو گئی۔ گندم پہلے ہی نایاب تھی۔ دیہات میں حالت بہت خراب تھی۔ وہاں کے لوگ دھیر کوٹ غلے کی تلاش میں آنے لگے۔ اور دھیر کوٹ میں کھانڈ ختم ہو گئی۔ کھانڈ کے بعد شکر کم ہونے لگی۔ اور آخر وہ بھی نہ رہی۔ میٹھی چائے کی بجائے نمک کی چائے ملنے لگی۔ اور ولی داد کی دکان پر صرف ایک ہی کھانا پکنے لگا۔ روسٹ مرغ قیمت ۱۲ ار فی پلیٹ، اب مکئی کی روٹیاں پکنے لگیں اور کچھ عرصہ کے بعد مکئی کا آٹا بھی مفقود ہونے لگا۔ جہاز مارکہ سگریٹ کی قیمت بڑھ گئی اور قینچی کی ڈبیا ۱۰ ار کی ہو گئی پشاوری تمباکو البتہ اسی طرح ملتا رہا۔ اس اثنا میں خزانے کی لاری آئی اور گذر گئی۔ اسکول کی تنخواہوں کے بل خزانے بھیجے گئے جہاں سے

وہ بیس دن کے بعد آئے۔ بلوں میں میزانِ کل غلط درج تھا تصحیح کی جائے!
میزانِ کل کی تصحیح کی گئی۔ اور دوبارہ خزانے بھیجے گئے جو دھیر کوٹ سے چالیس میل تھا۔

اس دوران میں دیہات میں قحط نے اپنا خوفناک جبڑا کھولا اور لوگ دھیر کوٹ کا رُخ کرنے لگے۔ پہلے وہ صبح آتے تھے مگر شام کو لوٹ جاتے تھے۔ مگر ان دنوں کسی نے انہیں کہا تھا کہ غلے کی لاریاں راولپنڈی سے چل پڑی ہیں اور آج کل میں دھیر کوٹ سے گذریں گی۔ اور غلہ آجائے گا۔ اس افواہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ رات بھی دھیر کوٹ میں گذارنے لگے۔ چائے کی دکانوں پر ہمیشہ رنگ رہتا رات کے وقت گانے کی آوازیں آتیں۔ اور دن ہوتے ہی ہجوم غلے کی دکانوں کے اردگرد جمع ہو جاتا۔ سارے دھیر کوٹ کی آنکھیں ۸ فٹ چوڑی سڑک پر جمی رہتیں جو چیل کے درختوں میں بل کھاتی ہوئی مشرق اور مغرب میں گم ہو جاتی تھی۔

ہجوم بدستور غلے کا انتظار کرتا اور بھوک اپنے دیوانوں کا مذاق اڑاتی!

اس اثنا میں دھیر کوٹ سے کچھ فاصلے پر ایک لاری الٹ گئی۔ وہ پل پر سے گذر رہی تھی۔ کہ پل ٹوٹ گیا۔ لاری ٹوٹ گئی۔ ڈرائیور اور کلینر دونوں مر گئے۔ ان کی لاشوں کو واپس دھیر کوٹ لایا گیا تو ہجوم لاشوں کو دیکھنے لگا۔ بالکل ایسے

کرں نہیں عجائب گھر کی چیزیں ہوں۔ نہ اُن کے منہ سے کوئی فقرہ نکلا اور نہ ہی کوئی آنسو بہا۔ ایک پتھریلی غیر جانب داری سب طرف حکمران تھی۔ انسان فانی ہے۔ مگر کاش وہ لاری غلے کی لاری ہوتی!

مقامی پولیس کے تھانیدار نے مظفر آباد ہیڈ کوارٹر کو لکھا کہ قحط کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ ہجوم تشویشناک ہے۔ لوگوں کی بے اطمینانی بڑھ رہی ہے۔ مظفر آباد کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کاغذ افسران بالا کو بھیج دیا اور آزاد کشمیر کی حکومت نے کیبنٹ میں بہت غور کرنے کے بعد وزارتِ امورِ کشمیر کو اطلاع دی۔ امورِ کشمیر کے انڈر سکرٹری نے وزیرِ داخلہ پاکستان کو مطلع کیا۔ اور پاکستان کے سیاسی حلقوں نے رائے ظاہر کی کہ اگر غلہ وقت پر نہ پہنچا تو رائے شماری پر اثر پڑے گا۔ بالآخر لاہور سے راولپنڈی کے کمشنر کو تار ملا کہ آزاد کشمیر میں غلہ بھیجنے کا فوراً انتظام کیا جائے!

مری روڈ پر لاریوں کا کانوائے آہستہ آہستہ غلہ لادنے لگا۔ ادھر دھیر کوٹ میں ہجوم کی تعداد بڑھتی گئی ــ جمعے کے دن لوگوں نے اکٹھے ہو کر نماز پڑھی۔ اور مولانا عبدالرحمٰن دیوبندی نے خطبہ دیا۔ اُنہوں نے اپنے وعظ میں کہا کہ روزے اسلام کے پُر تقویت ارکانوں میں سے ایک ہیں۔ روزے سے انسان سختی اور

گرمی کا مقابلہ کرتا ہے۔ کربلا کو یاد رکھو۔ روزے رکھو۔ آخرت پر ایمان رکھو۔ اور دعا کرو کہ اللہ ہمیں نیک بنائے اور قیامت کے روز ہم سب شفیعِ محشرؐ کے جھنڈے تلے دوبارہ اُٹھیں۔ آمین۔

"ربنا آمین۔ ثم آمین"۔ مسلمانوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

جمعے کی نماز کے بعد وہ پھر غلے کی دکانوں پر آ گئے۔ کچھ لاریاں آئیں۔ بعض کوہالے کی طرف سے، بعض راولاکوٹ اور باغ سے آئی تھیں۔ باغ سے آئی ہوئی لاری پر سے مسٹر ڈاربی شاہ، اُن کی بیوی اور ماسٹر خلیل اُترے۔ ماسٹر خلیل سکول کے عملے کی تنخواہ لائے تھے۔ اور مسٹر ڈاربی شاہ دیہات میں انجیل تقسیم کر کے لوٹے تھے۔ اُن کی بیوی نے سکرٹ پہنا تھا۔ اور اسٹاکنگ اُتاری ہوئی تھیں۔

ہجوم نے انہیں راستہ دے دیا۔ اور جب پادری اور اُن کی بیوی چلے گئے تو لوگ انہیں دُور تک دیکھتے رہے۔ اتنے میں پولیس کا تھانیدار اور کچھ سپاہی گزرے۔ ہجوم کچھ خوف زدہ ہوا مگر جب وہ فضل داد کی دکان کی طرف چلے گئے۔ ہجوم کی بے حس آنکھیں خالی سڑک پر غلے کی لاریاں تلاش کرنے لگیں۔

کچھ دیر کے بعد پولیس والے اُس کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے میں لے گئی۔ ہجوم میں کسی نے کہا کہ جاسوس ہے۔ اور اسی لیے گندم نہیں آتی۔

"اب گندم امریکہ سے آئے گی" ایک نے کہا
"امریکہ کہاں ہے؟"
"امریکہ بھی نہیں جانتا۔ امریکہ سب کچھ ہے" یہ سب کچھ امریکہ ہے۔ ہائی اسکول، تھانہ، اور پادری"
ہجوم چائے پینے کے بعد بکھرنے لگا۔
ولی داد کی دکان پر چائے پیتے ہوئے پنجاب سے آئے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔
"آپ جانتے ہیں امریکہ کی گندم کو۔ اس میں آٹا نہیں ہوتا"
دوسرے نے تعجب ظاہر کیا تو اس نے وضاحت کی۔ اس نے کہا کہ امریکہ والے جو گندم ہمیں بھیجتے ہیں اُسے پہلے مشینوں میں ڈالا جاتا ہے اس طرح اس کے اندر سے سارا گودا نکل جاتا ہے اور چھلکا رہ جاتا ہے۔ وہ چھلکا ہم کھاتے ہیں۔
پاس کے ایک شخص نے اعتراض کیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے
"آپ بھی غضب کرتے ہیں، مانتے نہیں۔ یہ سب مشینوں کی بات ہے"
"کاش ہمارے پاس بھی مشینیں ہوتیں"
ولی داد اور ہائی سکول کے استاد یوسف کا جھگڑا ہو رہا تھا۔ یوسف کا خیال تھا ولی داد نے حساب غلط لکھا ہے۔ اس کے ذمے ساٹھ روپے تھے اور ولی داد اسی روپے مانگتا ہے

"مرغے کی قیمت زیادہ ہوتی ہے" ولی داد نے کہا

"میں لعنت بھیجتا ہوں مرغے پر اور تجھ پر" یوسف بھنا کر بولا

کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ولی داد نے ان سے مخاطب ہو کر کہا "عجیب زمانہ آگیا ہے۔ استاد ہو کر لڑائی کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو بے ایمان بناتے ہیں۔ خدا کی قسم میں ہوٹل کی بجائے اگر فوج میں ہوتا تو اس وقت تک محل بنا لیتا"

"سارا آزاد کشمیر تو محل بن چکا ہے صرف تمہارے محل کی کسر تھی"

مولانا عبدالرحمٰن کہیں سے آگئے۔ اور سب خموش ہو گئے۔

ہجوم پھر غلے کی دکانوں پر جمع ہو گیا۔ غلے کے ٹھیکیدار نے کہا کہ ابھی تار ملا ہے لاریاں آنے والی ہیں ہجوم نے اپنی اپنی بوریاں اٹھائیں۔ اور سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ جب وہاں لاریاں نظر نہ آئیں تو بوریاں پھر رکھ دیں۔ اور سب ان پر بیٹھ گئے۔ اب ہجوم میں بعض عورتیں تھیں۔ اور کچھ بیمار بوڑھے بھی۔ موسم برسات تھا اور ٹھنڈک ہو چکی تھی۔

ٹوپی والا فضل داد کے ہوٹل پر واپس آگیا۔

دو ایک فوجی لاریاں گزریں اور ہارن بجاتے بجاتے گزر گئیں۔ باغ موٹر سروس کی ایک لاری آئی اور موٹر مڑتے وقت پھسل گئی اور پھسلتے وقت کیچڑ میں پھنس گئی۔ ہجوم تماشہ دیکھنے لگا۔ ڈرائیور نے کلینر کو کہا کہ وہ دھکا دے۔ جب وہ دھکا دینے لگا خود پھسل گیا اور پھسلتے پھسلتے لاری کے نیچے گھستا چلا گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو کیچڑ سے پوری طرح بھر چکا تھا۔ اس نے موٹر سروس کو بڑی بد دعائیں دیں۔

اور ولی داد کی دکان میں گھس گیا۔ ڈرائیور تارکا سگریٹ پینے لگا۔
لوگ تماشہ دیکھنے لگے!

کچھ دنوں کے بعد پولیس پھر آئی اور ٹوپی والے کو پکڑ کر لے گئی۔ غلے کی لاریاں ابھی تک نہ آئی تھیں مگر ہجوم نے سمجھا اور قریباً قریباً مان بھی لیا کہ غلے کا نہ آنا ٹوپی والے کی شرارت ہے۔ سب نے کہا کہ وہ ہندوستان کا جاسوس ہے۔ اور ہندوستان کو غلے کی بوریاں بھیجتا ہے۔ ایک نے کہا کہ ٹوپی والا رات کو ہندوستان چلا جاتا ہے اور دن کو واپس آجاتا ہے۔ ہجوم میں ایک لڑکی نے کہا کہ اُن کے گھر چولھا جلے دس دن ہو چکے ہیں۔ وہ سب ناشپاتیاں کھا رہے ہیں۔ سکول کے ایک طالب علم نے کہا کہ کیلوں کی غذائیت امریکی گندم سے زیادہ ہے۔ جو لوگ بیمار تھے وہ بارش کے بعد چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ رہے تھے۔ ہجوم دکانوں کے سامنے تھا۔ سکول میں پرائمری کے طالب علم پہاڑے پڑھ رہے تھے۔

پونچھ ہل ٹرانسپورٹ کی لاری آئی۔ مسافر باغ سے آئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد ولی داد کی دکان پر لوگ جمع ہونے لگے۔ "نمک ڈالی چائے" اور ولی داد کی باتیں' اسکول میں چھٹی ہو گئی۔ اور سب اُستاد اپنی کھانڈ لے کر اپنے لئے چائے کی پیالی بنانے آ گئے۔

پولیس نے ٹوپی والے کو دوبارہ چھوڑ دیا۔

باغ سے آنے والے مسافروں نے کہا کہ راولاکوٹ سے باغ کو جاتی ہوئی غلے کی لاریاں راڑہ گیل سے کچھ پرے لوٹ لی گئی ہیں۔ وہاں ہجوم نے گندم چھین لی ہے اور راولاکوٹ سے ۱۴/۲ رجمنٹ

مارچ کر چکی ہے۔ لاریوں کے ڈرائیور اور کلینر بھاگ گئے ہیں۔

ٹوپی والا فضل داد کی دکان پر چائے پی رہا تھا۔

ہجوم غلے کی دکانوں پر بیٹھا بیٹھا تنگ آ چکا تھا۔ کسی نے کہا کہ ٹوپی والا آ گیا ہے۔ ہجوم میں سب نے کہا کہ غلے کا نہ آنا ٹوپی والے کی شرارت ہے۔ ہجوم فضل داد کی دکان پر ٹوٹ پڑا اور ٹوپی والا ڈر کر چوبارے میں گھس گیا۔ لوگ چیخنے لگے،

"یہ جاسوس ہے"

"یہ ہمارا دشمن ہے"

"ہندوستان مردہ باد"

"آزاد کشمیر زندہ باد"

کسی نے نعرہ لگایا "نعرۂ تکبیر"

ہجوم نے "اللہ اکبر" کہا اور چوبارے کا دروازہ ٹوٹ گیا۔

ٹوپی والا ڈر کے مارے بیہوش ہو چکا تھا۔ اتنے میں پولیس آ گئی۔ ہجوم سہم کر ایک طرف ہو گیا۔ تھانے دار کے حکم سے ٹوپی والے کو چارپائی پر ڈال کر تھانے لے جایا گیا۔ اتنے میں گھوں گھوں کی آواز سنائی دی۔ دور سے لاریوں کا قافلہ آہستہ آہستہ ظاہر ہوا۔ قریب آیا اور گزرتا گیا۔ جب لاریاں گزر گئیں تو کسی نے کہا کہ ان میں گندم تھی۔ سڑک پر کچھ گیہوں کے دانے بھی گرے تھے۔ مگر سب نے کہا کہ لاریوں میں بارود تھا۔ گندم کے دانے ٹوپی والے کی جیب سے گرے ہیں

صبح سے پہلے

تحصیلدار پچھلے ایک مہینے سے پریشان تھا۔ غلے اور کپڑے کا راشن تھا۔ مگر راشن کی دکانوں پر نہ تو غلہ نظر آتا تھا اور نہ ہی کپڑا۔ تحصیل باغ کے لوگ اناج اور لٹھے کی تلاش میں روزانہ آتے اور چائے کی دکانوں پر بیٹھ بیٹھ کر واپس گھروں کو چلے جاتے تھے۔ اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ چائے کی دکان والوں کا کاروبار بڑھ گیا تھا۔ شریف رنگریز پگڑیاں رنگنے کی بجائے چائے کی دکان کھولنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ غلام جو کی دکان پر کافی بھیڑ رہتی تھی۔ اور اکثر لوگ "نوائے وقت" پڑھنے آتے تھے جس کے مضامین سنسنی خیز ہوتے تھے۔ جب سے سردار پٹیل کا فرنیچر والا سکنڈل شائع ہوا تھا۔ نوائے وقت کی خریداری بڑھ گئی تھی۔ یہ عبوری حکومت کا دور تھا۔ چونکہ تھوڑے ہی دنوں میں آزادی ملنے والی تھی۔ اس لئے ہوا میں اضطراب تھا۔ لوگوں میں اضطراب

تھا۔ اور شاید اسی لئے راشن کی دکانیں بھی خالی ہوگئیں تھیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد انڈین آرمی کے بہت سے سپاہی فارغ ہو چکے تھے۔ تحصیل باغ کی ایک بہت نمایاں آبادی فوج میں تھی۔ اس لئے جب برطانوی ہند میں حالات اوپر نیچے ہونے لگے۔ فوج کے بے روزگار سپاہیوں کی زندگی یہاں بھی بے چین ہونے لگی۔ وہ اپنی بندوقوں کو صاف کرتے رہتے۔ مگر کس لئے؟ اس کا جواب ان کے پاس موجود نہ تھا۔

باغ ایک چھوٹی سی بستی ہے جو دو ندیوں کے درمیان ٹیلے پر واقع ہے۔ اونچے پہاڑ اوپر سے جھانکتے ہیں۔ اور اتولی پیر کا سلسلہ کوہ فصیلوں کی طرح پھیلا رہتا ہے۔ اس بستی میں سب سے نمایاں سکھوں کا گوردوارہ تھا۔ اور علاقے میں سکھوں کی خاصی تعداد تھی۔ پچھلی صدی کے شروع میں جب سکھوں کی حکومت ختم ہوئی تھی بہت سے سکھ کشمیر کے اس علاقے میں چلے آئے تھے۔ اور تب سے یہیں وہ رہتے تھے۔ گوردوارے کے علاوہ تحصیل کے دفاتر، گورنمنٹ ہائی سکول اور ہسپتال نمایاں تھے۔ لکڑی کا ایک دو منزلہ مکان مسجد کے سامنے تھا جہاں شریف رنگریز رہتا تھا۔ اسے قریب کی بہت سی لڑکیوں کا نام و پتہ معلوم تھا۔ شاید اسی لئے وہ نئی فلموں کے ریکارڈ خرید لاتا اور جب رات کو چاندنی کوہساروں کا گہنا بن کر چھا جاتی وہ فلمی

جگنو کے ریکارڈ بجاتا۔ دوسری نظموں میں سے اُس کا مرغوب گانا یہ تھا "جب اُس نے گیسو بکھرائے"

سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے طالب علم اُس کے دوست تھے۔ جب وہ رات کی چائے پینے کے لیے سرور کی دکان پر آتے تو شریف بھی آجاتا۔ ندی کے پاس سے ماسٹر گل جو بھی آجاتے۔ اور پھر سب ریکارڈ بجانے اور سننے کے لیے دو منزلہ مکان کا رخ کرتے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مکئی کی فصل ابھی ہری تھی۔ گورنمنٹ سکول ابھی کھلا تھا۔ اور میری والدہ ابھی جیتی تھیں۔ مکئی کی فصل اب بھی اُگتی ہے مگر گورنمنٹ سکول کی صورت بدل چکی ہے اور میری والدہ میرا ساتھ چھوڑ چکی ہیں۔ زندگی نے آنسوؤں کا گھونٹ پی رکھا ہے۔ مگر اُس زمانے میں مجھے آنسوؤں سے ابھی آشنائی نہ ہوئی تھی۔ میں انگریزی کا ایم۔ اے کر رہا تھا۔ پنجاب میں فساد ہو رہے تھے۔ اور جس رات میں تحصیل باغ کے لیے لاہور کے اسٹیشن سے گاڑی پر سوار ہوا تھا اُس رات پرانے شاہ عالمی نے آگ میں غسل کیا تھا۔

میں اس بستی میں چھٹیاں گذارنے اور امتحان کی تیاری کے لیے آیا تھا۔

یہاں میری ملاقات قیوم سے ہوئی۔ نوجوان اور خوش قیوم جسے میں بچپن سے جانتا تھا۔ اُن دنوں وہ حیدر آباد دکن سے آیا تھا۔ اور اردو بولتا تھا۔ اُسے دیکھ کر

مجھے خواہ مخواہ سرجیت کی یاد آتی ہے۔ مگر اس وقت وہ طالب علم نہ تھا۔ اُس نے جنگ کے دن برما اور امپھال کے جنگلوں میں گذارے تھے۔ اور اب سولجر بورڈ میں ملازم تھا۔ میری اُس سے بہت کم باتیں ہوئیں۔ اور ملنے کے دو ہی روز کے بعد وہ سولجر بورڈ سے چلا گیا۔ میرے ملنے والوں نے بتایا وہ پنجاب میں کہیں ملازمت کر رہا ہے۔

گو دکانوں پہ نہ تو تمباکو تھا اور نہ ہی کپڑا تاہم چائے بہت تھی۔ اور جب چائے کافی تعداد میں مل سکتی ہو آدمی گرد و پیش کو بھول جاتا ہے۔ میں اُن دنوں وہاں کی نیلی چادروں میں تیرا کرتا تھا۔ سنسان مگر خوبصورت پہاڑیوں کو دیکھتا اور مجھے اُڑنے کی خواہش ہوتی۔ بعض اوقات میں کسی تنہا درخت کے نیچے بیٹھ کر چاروں طرف پھیلی ہوئی فصیلوں کو دیکھتا جو صدیوں سے خموش تھیں۔ اُن کا جسم خاموش تھا اور اُن کی نبضیں چپ چاپ تھیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا پنجاب بہت دُور ہے۔ جہاں بجلی کے قمقمے جلتے ہیں۔ اور ریل گاڑی کی آواز آتی ہے۔ جہاں دریاؤں کے قدم سُست ہیں۔ اور جہاں لڑکیوں کے دلوں میں پیار خوشبو کا غلاف بن جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پہ جب گراموفون پر امیر بائی کرناٹکی کا گیت "مار کٹاری مر جانا" فضا میں گونجتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے سب پہاڑیاں ہچکیاں لے رہی ہیں۔ ندیاں دُکھ کی شکایت کر رہی ہیں۔ اور زندگی دھیرے دھیرے اپنا منہ بے نقاب کر رہی ہے!

گو باغ میں ہر طرف اقتصادی مدوجزر رُونما ہو رہا تھا۔ مگر مجھے اس مدّوجزر سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ مجھے سگرٹ مل جاتے تھے، اسکول کے طالب علم میرے دوست تھے۔ اور ماسٹر گل جُو کی باتیں مجھے پسند تھیں۔

ایک دن ماسٹر گل جُو نے پوچھا کہ میں ایم۔اے کر کے کیا کروں گا؟

میں نے کہا "مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ مگر میں گیت کہنا چاہتا ہوں — میں یہ نہیں جانتا کہ میں اچھے گیت لکھ بھی سکوں گا مگر جب میں پہاڑیوں کے بازوؤں پہ بادلوں کی گردنیں جھکی دیکھتا ہوں مجھے زندگی خواب کی مانند خوشنما نظر آتی ہے"

جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے کچھ فاصلے پہ ایک لڑکی بکریاں چرا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں، اور پھٹے ہوئے گریبان کے اندر سے بکریوں کے دودھ کا سا سفید جسم دکھائی دے رہا تھا۔

اُس نے پوچھا میرا اس لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے۔

"میں اسے ہر روز دیکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "مگر وہ پہاڑی گھاس کی مانند خود پسند ہے۔ اُس کا سینہ آڑو کے پھل کی طرح خوشگوار ہے۔ وہ گذرتی ہے تو موتی سونے زرخیزی کے بیچ بکھرتی ہیں۔"

گل جُو نے جیب سے ایک بوتل نکالی اور کہنے لگا۔

"یہ بھی میرے دل کی باتیں ہیں" کچھ رک کر اُس نے کہا "آپ شراب کو ناپسند تو نہیں کرتے؟"
اور بوتل سے گھونٹ گھونٹ انگور پینے لگا۔ جیسے چشموں کا پانی کنول کے پھول پیتے ہیں۔
گل بتو کی عمر پچیس سال کے قریب تھی۔ اُس نے کہنا شروع کیا "جیسے یہ لڑکی چشموں کے
پانی کی طرح شفاف ہے اسی طرح میں جس کی آرزو کرتا ہوں وہ خوشنما ہے۔ مگر وہ بھی
خود پسند ہے۔ مگر خود پسندی آخر چیز کیا ہے؟ پہاڑی گھاس، آڑو کا پھل اور موتی
سونے کی زرخیزیاں سب فنا ہونے والی باتیں ہیں۔ اسی طرح وہ خوبصورت لڑکی بھی
فنا ہو جائے گی۔ مگر میں اُس کی موت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ مجھے اُس کی زندگی سے
پیار ہے۔ لیکن اگر اُس کے گالوں پہ چیچک نکل آئے تو پھر وہ تمام عمر اپنا منہ چھپاتی
رہے گی۔ میں اُس وقت بھی اُسے چومنے کی خواہش کروں گا۔ جب میری آنکھوں میں
اُس کا حسن ازلی کی مانند جاوداں ہے تو پھر وہ مجھ سے گریز کیوں کرتی ہے؟"

میں نے کہا کہ خوبصورتی اپنے گریز سے خریدار پیدا کرتی ہے۔

"یہ پیالہ لبوں پہ سہمی ہوئی نیلی آنکھیں خوبصورت ہیں۔ پہاڑوں پر جمی ہوئی کنواری
برف خوبصورت ہے۔ شاید اسی طرح دلوں میں سوئی ہوئی آرزو بھی خوبصورت
ہے۔ ہمیں آرزو کی تلاش ہے اور جو آرزو کے بغیر جیتا ہے وہ زندگی سے محروم
رہتا ہے۔ زندگی تمناؤں کا آستانہ ہے۔ اور ہم اس آستانے پہ چراغ لیے پھرتے رہتے"

ہیں۔ کہ کب صبح آئے کہ کب ہمارا دن طلوع ہو۔۔۔۔؟

اتنے میں شریف نے گراموفون پر ریکارڈ بجنے لگا۔ "آجا میری برباد محبت کے سہارے" ہیں اور گل بوجو ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف دیکھنے لگے جس کا چہرہ گلنار کی طرح سرخ تھا جیسے شرمائی ہوئی لڑکی دیکھ رہی ہو۔

وہ دن کتنے خوبصورت تھے۔ دو میدانوں میں زندگی آگ اور خون سے جنم لے رہی تھی مگر میرے ارد گرد رومان، خواب اور گیت بکھرے ہوئے تھے۔ تحصیلدار پریشان تھا۔ تحصیل کے سارے ملازم اور تھانے کے سپاہی پریشان تھے۔ لوگ پریشان تھے مگر میرا دل رنگوں میں کھویا ہوا تھا۔ اور آج سب خوابوں میں کھوئے ہوئے ہیں مگر میں پریشان ہوں۔ آج کل میں اپنے آپ سے یہی پوچھتا رہتا ہوں "صبح کب آئے گی؟" مگر جواب نہیں ملتا۔ ان دنوں بھی میں پریشان ہوا تھا۔ مگر وہ پریشانی بالکل جداگانہ تھی ـــــ

مجھے ان خموشیوں سے پیار ہو گیا۔ اور جب خموشیاں ندی کے پانی میں سنبھل سنبھل کے بہتیں تو مجھے ہر اس شے سے محبت ہو گئی جو آسمانوں کی طرح پاکیزہ تھی۔

اور جب پاکیزگی نے شکل اختیار کی تو مجھے وہ لڑکی پسند آ گئی جسے میں نے گل بو سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ خود پسند ہے! میں نے اس کی یاد میں ہنسی ہی

راتیں ستاروں کی چراغاں کیں۔ اور کتنی ہی اُداس شامیں چشموں کے قریب گذار دیں، میں نے بہت سے گیت لکھے اور ان پر آنسوؤں کی شبنم بکھیر دی،
اور جب وہ گیت بھی مُنہ سے بول نہ سکے تو میں نے اُنہیں جلا دیا۔
ایک رات میں بہت اُداس تھا۔ اور برسات میں کئی دنوں کے بعد چاند نکلا تھا۔ سکول میں عشق پیچاں اور ناگ بیل کے پھول کھلے تھے۔ ندی کی آواز خوشگوار تھی۔ میں اپنی سگرٹوں کی ڈبیا کے ساتھ اسکول سے کچھ فاصلے پر اُداس بیٹھا تھا۔ دُور پہاڑ کی چوٹیاں چاندنی کا لباس پہنے چٹانوں سے لگ کر سو رہی تھیں۔ ندی کے کنارے پولیس کا پختہ قید خانہ چپ تھا۔
میں نے نظم لکھتے لکھتے کئی بار ندی کے پار دودھ کی مانند چمکتے ہوئے راستوں کو دیکھا۔ راستے بھی ویران تھے! میں نے لکھا ؎

پھول کانوں میں کھل کے مُرجھائے
چاند راتوں نے کروٹیں بدلیں
اور حریری گداز باہوں نے
اپنی پوشش کی سلوٹیں بدلیں

۔۔۔۔۔

میں نے خاموش رہگذاروں پہ
تیرا کتنا ہی انتظار کیا
ذرّے ذرّے نے آستاں بدلے
میں نے تیرا ہی اعتبار کیا!

میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ میں کس کا انتظار کر رہا ہوں۔ کیا میں اُس لڑکی کا انتظار کر رہا ہوں جو دن کے وقت بکریاں چراتی ہے۔ کیا میں اُس کے ہونٹ پسند کرتا ہوں جو جنگل میں کھلے ہوئے گلاب کی طرح سُرخ ہیں۔ یا مجھے وہ اس لیئے پسند ہے کہ اُس کا دل ندی کے پھولوں کی مانند نازک ہے۔

میں نے چاند سے کہا صبح کو آواز دے۔ جب صبح آئے گی وہ بھی آجائے گی۔ پہاڑی گھاس کی مانند خود پسند۔ میں نے بید کے درختوں کو کہا کہ صبح کی ہواؤں سے کھیلتے رہیں۔ صبح کی ہوا اُس کی طرح خوشگوار ہے۔ اور پھر اپنے دل سے کہا زندگی کے زخم بے دریغ ہیں۔ سب زخموں کی دوا آنسو ہیں۔

اور میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

میرے قریب سے پولیس کا سپاہی نمودار ہوا اور میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔
میں سگرٹ پیتا رہا۔ اور نیند میں سوئے ہوئے کانوں کی طرف دیکھتا رہا۔
جاتے ہوئے اُس نے کہا "ملاقے میں بے اطمینانی بڑھ رہی ہے"
اُس رات کی صبح پیاری تھی۔ اُس نے مجھے مسکرا کر دیکھا تھا۔ وہ اپنے درخت کی نارنگیاں لائی تھی۔

وہ وادی کے چشموں پر بیٹھی رہی۔ اور میں اُسے دور سے دیکھتا رہا۔
صبح کی شہزادی، پانیوں پر کرن کی طرح جاگی ہے،
وہ کنوارے دنوں کی طرح معصوم ہے
جیسے انگورستانوں کا پہلا پھول، اور عشق پیچاں کی پہلی پتی!
میں اُسے آج بھی یاد کرتا ہوں کیونکہ وہ صبح کی مانند روشن ہے!

جولائی کا مہینہ خواب اور خواہشات میں کٹتا گیا۔ اور اگست کے دن آگئے۔ اور آخرکار وہ دن بھی آگیا جب عبوری حکومت ختم ہوئی تھی اور آزادی کے دن شروع ہونے والے تھے۔ ۱۴ اگست کی رات سب پہاڑیاں آگ کے شعلوں سے روشن تھیں۔ دیہاتوں، ویرانوں اور آبادیوں میں ہر جگہ چراغاں ہوئی۔

تحصیل باغ میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس نے کراچی میں ہونے والے جشن کا خوشی کے
ساتھ خیر مقدم نہ کیا تھا۔ لوگ پنجاب کی طرف منہ کر کے دعائیں کرتے تھے۔ کہ
خدا نے وہ دن لایا ہے جو مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن ہے اور جس سے
آنکھوں کی روشنی قائم ہے!

تحصیل باغ کے ہر گھر میں قائداعظم کی تصویر تھی۔

۱۵ اگست کے بعد تحصیل باغ کا نقشہ بدلنے لگا۔ تحصیلدار نے وزیر کو لکھا
کہ حالات مخدوش صورت اختیار کر رہے ہیں۔ لوگ سری نگر سے آنے والی خبروں
کا انتظار کر رہے تھے۔ اور مہاراجہ خموش تھا۔

مہاراجہ خموش تھا۔ مگر اس کے بازو حرکت میں تھے۔

۱۶ تاریخ کو ہر طرف سے ڈوگرہ فوج کے دستے آنے لگے۔ ان کے آنے سے پہلے
فضائیں ہری تھیں اور راستے چاندنی کی طرح سفید تھے۔ اب فضائیں گھٹنے لگیں
اور کٹائی کیے ہوئے کھیتوں میں خیمے لگنے لگے۔ راستے خچروں اور سپاہیوں کے
فوجی جوتوں سے زخمی ہو گئے۔ مگر فوج کے دستے آتے گئے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد
تحصیلدار سے چارج لے لیا گیا اور فوج کے بریگیڈیئر کی حکومت شروع ہو گئی۔
اب دن کے وقت بھی خموشی رہتی تھی اور رات کے وقت سناٹا رہنے لگا تھا۔

اسکول بند ہو چکا تھا۔ چائے کی دکانوں پر آمد و رفت کم ہو چکی تھی اور شریف کا گراموفون خاموش ہو گیا تھا۔ خموشی رات کی اندھی روشنی بن کر بکھر رہی تھی!
ڈوگرہ سپاہی ہر وقت وائرلیس پر پیغام بھیجتے رہتے تھے۔ ان کے رسل و رسائل کا سلسلہ راولاکوٹ، کوہالہ اور پونچھ سے قائم تھا۔ مہاراجہ کشمیر کے فوجی بارڈ ہر طرف موجود تھے۔

بستی کے لوگ سہم گئے۔ اور گھروں میں گونجنے والی آوازیں چپ ہو گئیں۔
ایسی فضا میں چھوٹی عید آئی جیسے پردیس میں شوال کا چاند چمکتا ہے۔
بستی میں سب دکانیں بند تھیں۔ اور چند ایک جو کھلی ہوئی بھی تھیں ان پر سگرٹ نہ تھے۔ بستی کے تمام سگرٹ ڈوگرہ فوج کے سپاہی اٹھا لے گئے تھے۔ چائے کی پتی بھی نایاب تھی۔ کپاس کے ٹکڑے اور دودھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لوگ بغیر دودھ اور بنا کھانڈ کی چائے پی رہے تھے۔ فضا نے جو بکرا ذبح کیا تھا وہ بیمار معلوم ہوتا تھا۔

عید کے دن جو سورج نکلا اُس کی صورت بجھی بجھی تھی۔
کچھ لوگوں نے فطر کی نماز پڑھی۔ اور نماز پڑھنے کے بعد فوراً ہی منتشر ہو گئے۔
جب میں بازار سے گذرا جہاں چائے کی دکان پر شریف بیٹھا کرتا تھا۔ وہاں

معمول کی طرح کچھ لوگ ضرور تھے۔ شریف وہاں نہ تھا۔ البتہ پولیس کے کچھ سپاہی بیٹھے تھے۔ اور نمک والی چائے پی رہے تھے۔ علاقے سے آئے ہوئے لوگ خوش تھے۔ ایک نے نسوار کی ڈبیا کھولی ہوئی تھی اور نسوار مل رہا تھا۔ سرور کیتلی میں گرم پانی انڈیل رہا تھا۔

میں رُک گیا۔ اور اُن کے پاس بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

سرور نے عبدالخالق سے کہا کہ وہ جو کچھ پوچھنا چاہتا ہے مجھ سے پُوچھ لے۔

عبدالخالق علاقے سے آئے ہوئے ایک شخص کا نام تھا۔ اُس نے اوورکوٹ پہنا ہوا تھا۔ باہر موسم ذرا ٹھنڈا تھا۔

عبدالخالق نے کہا کہ وہ کچھ زیادہ پوچھنا نہیں چاہتا صرف ایک سوال اُسے پریشان کرتا رہتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کو پاکستان کیوں کہتے ہیں؟

میں نے جواب دیا "پاکستان ہماری آرزؤں کی آواز ہے۔ اور خدا کے محبوب لوگوں کا وطن ہے اس لیے اس ملک کو پاکستان کہنا بے محل نہیں"

عبدالخالق نے سرور کی طرف دیکھا۔ تو سرور نے کہا

"یہ تو ٹھیک ہے مگر وہ ــــ کہ پ، پنجاب، س، سندھ۔۔۔"

میں نے اس کا اشارہ بھانپتے ہوئے کہا

"تو آپ کا مطلب کاف سے ہے۔ پاکستان میں کاف کیا ہے — کاف سے یقیناً "کشمیر مراد ہے"

عبدالخالق نے کہا "اگر کشمیر پاکستان میں شامل نہ ہوا تو کیا پاکستان کا نام بدل جائیگا"

پولیس کے ایک سپاہی نے کہا "پھر پاستان ہوگا۔ پاکستان تو نہیں ہو سکتا"

دوسرے سپاہی کا نام طالب حسین تھا۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا

"سب کچھ مہاراجے پر منحصر ہے۔ اگر وہ چاہے تو پاکستان کی کاف باقی رہ سکتی ہے"

محلے کے دوسرے آدمیوں نے کہا کہ طالب حسین درست کہتا ہے۔

عبدالخالق گرم ہو گیا۔

"سب کچھ مہاراجے پر کیوں منحصر ہے۔ ہم اس ریاست میں رہتے ہیں۔ یہیں ہمارے باپ دادا رہتے تھے۔ ہم آزاد تھے۔ اور صدیوں سے آزاد رہے تھے۔ پھر ڈوگرے آگئے اور انہوں نے ہمیں توپوں سے اڑا دیا۔ نراڈ کھل آج بھی اسی طرح موجود ہے جہاں ان ڈوگروں نے ہمارے بزرگوں کی کھالیں زندہ اتروا دی تھیں — مگر آج ہم طاپاں بہ ما اور بن نمازی سے ہو آئے ہیں۔ اگر ہم جاپانیوں اور جرمنوں سے لڑ سکتے ہیں تو مہاراجے سے بھی لڑ سکتے ہیں۔ ہماری لڑائی سچائی کے لئے ہے ——"

اس موقعہ پر دکان کا ملازم لڑکا صالح باہر سے بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے کہا

فوجی ادھر آ رہے ہیں۔

سب خموش ہو گئے

مارچ کرتے ہوئے فوجیوں کے قدم قریب آتے گئے۔ ٹھک! ٹھک! ٹھک! ٹھک! انہوں نے سٹین اور برین گنیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ سب سے آگے ایک ادھیڑ عمر کا افسر تھا۔ اس نے تلوار لگائی ہوئی تھی۔

فوجی سرور کی دکان کے پاس آ کر رک گئے۔

افسر نے باہر ہی سے پوچھا "کس کی دکان ہے"

سرور نے جواب دیا "جناب میری دکان ہے"

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دکان بند ہونی چاہیئے"

سرور نے کہا "جناب عید کا روز ہے۔ اور کچھ ملنے والے آ جاتے ہیں۔ اس لئے کھولی ہوئی ہے"

افسر نے ایک فوجی سے کچھ کہا اور فوجی دکان کے اندر آ گیا۔ اس نے سب سے ان کا نام اور پتہ دریافت کیا اور کاغذ پہ کچھ لکھتا رہا۔ میرے قریب آ کر اس نے پوچھا کہ میں کون ہوں۔

میں نے جواب دیا کہ میں طالب علم ہوں۔ اور پنجاب کے کالج میں پڑھتا ہوں۔

فوجی چلے گئے

جب میں سکول کے بورڈنگ کو جاتے ہوئے ناشپاتی کے درختوں کے پاس سے گذر رہا تھا۔ تو مجھے دور سے دہی لڑکی بکریاں چراتے ہوئے دکھائی دی۔ اس کے کپڑوں کا رنگ شوخ تھا۔ وہ سبز گھاس پہ بہار کی تتلی دکھائی دیتی تھی۔ میں ایک درخت سے لگ کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے دیکھتا رہا۔ وہ صبح کی مانند خوبصورت تھی۔ کبھی اس کا پیار اور بانسری کے گیت کی طرح ہلکا جسم ساری دنیا پہ پھیل جاتا اور کبھی وہ ایک معمولی لڑکی کی طرح نظر آنے لگتی۔ وہ میرے لئے بیک وقت خواب بھی تھی اور اس کی عجیب و غریب تعبیر بھی۔ میں سوچتا رہا کہ کیا کشمیر اس خوبصورت لڑکی کی طرح خوبصورت ہوگا۔ اور جیسے یہ خوش ہے اور مسکراہٹوں کو چُنتی ہے اسی طرح جب کشمیر اپنی نئی زندگی کا لباس اوڑھے گا ہر طرف شادابیوں، اور محبتوں کی دنیائیں پھیل جائیں گی۔ مجھے اس کے دلکش اعضاء میں مستقبل کی تازگی دکھائی دیتی تھی۔ وہ خود پسند تھی اسی طرح کشمیر خود پسند ہوگا۔ وہ خوشگوار تھی، اسی طرح آنے والے دن بھی خوشگوار ہوں گے۔ اتنے میں پاس سے ایک فوجی سپاہی سٹین گن لئے گذرا۔ اس نے زور سے چلّا کر آواز دی

"او لڑکی!"

بکریاں چراتی ہوئی لڑکی چونکی۔ اس کا قد خم کھا گیا۔ وہ لچکی اور عجیب انداز میں
انجیر کے درختوں سے ہوتی ہوئی پہاڑی کی دوسری طرف چلی گئی۔

فوجی میرے پاس آیا اور دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ وہ میرا ہم جماعت تھا جب
ہم اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔

"تم سٹین گن اٹھائے ایسے پھرتے ہو جیسے سارے پہاڑ ہی پھونک دو گے"

اس نے کہا "دیکھتے رہو ہمارے پاس اسلحے کی کمی نہیں۔ اور بہت سی توپیں
بھی ہیں جو پہاڑی کے دوسری طرف گولے پھینک سکتی ہیں"

"اس میں فخر کی کیا بات ہے" میں نے کہا "لوگ مریں گے اور تم قاتل کہلاؤ گے"

فوجی کا نام شنو جی تھا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ لوگ مرتے ہیں یا جیتے ہیں۔ میں سپاہی
ہوں اور جو حکم ملتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں"

میں نے بھنا کر کہا "تو کیا اس لڑکی کو پہاڑی پر سے ہٹا دینے کا حکم بھی فوجی حکم ہے؟"

"کون سی لڑکی؟" شنو جی نے حیران ہو کر پوچھا

"وہی! جسے تم نے چلا کر کہا تھا او لڑکی!"

شنو جی ہنس دیا۔

"اب سمجھا! تو تم عشق کر رہے ہو" اُس نے کہا "تمہاری دُور سے عشق کرنے کی عادت ابھی تک نہیں گئی۔ یہ خون جلانے والی بات ہے۔ کیا وہ خوبصورت ہے؟"

"بہت خوبصورت"

شوجی نے آہ بھرتے ہوئے کہا "یہاں سب لڑکیاں خوبصورت ہیں — مگر مجھے خوبصورتی دیکھنے کی عادت نہیں، میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔ تم سمجھ چکے ہوگے"

میں نے جواب دیا "میں فوجی کے رکتے ہوئے عشق کو خوب جانتا ہوں —

شوجی ہنسنے لگا۔ اُس نے جیب سے تارکی ڈبیا نکالی۔ اور ایک سگرٹ دیتے ہوئے کہنے لگا "لو، تارکا سگرٹ پیو! بازار میں تو ایک بھی سگرٹ نہیں ملتا"

میں نے کہا "میں تارکا سگرٹ نہیں پیوں گا"

اُس نے سگرٹ رکھ لیا۔ اور سلگاتے ہوئے واپس جانے لگا۔ مگر کچھ دُور جانے کے بعد رکا اور قریب آتے ہوئے پوچھنے لگا۔

کہ کیا میں نیومم کو جانتا ہوں۔

"وہ سوئچر بورڈ میں ملازم تھا"

شوجی نے کہا "میں بھی اسے اسکول میں جانتا تھا۔ ان دنوں وہ بہت اچھا تھا۔
مگر اب وہ بہت خطرناک بن چکا ہے۔ سُنا ہے ملاتے میں جو گڑبڑ ہو رہی ہے۔
وہی کرا رہا ہے"

میں نے پوچھا "اگر تمہیں قیوم پر گولی چلانے کا حکم ملے تو کیا تم گولی چلا دو گے؟"
شوجی نے سوچکر کہا "کیا کہہ سکتا ہوں، مگر کیا ہی اچھا ہو اگر وہ ایسی باتیں
نہ کرے"

جاتے ہوئے اُس نے کہا

"دوست آخر دوست ہوتے ہیں"

. . . .

بورڈنگ ہاؤس میں گل جو بیٹھا تھا یوسف اور شیر افضل بھی آئے ہوئے تھے۔
جہاں تک سگرٹ کی ڈبیاں میز پر پڑی تھیں گل تو شاک۔ جبٹر چپکا کہ رہا تھا۔
ہم سب خوش تھے۔ اور گل۔ بد کی بوتل بھی خالی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد سکول
کا باورچی علی شیر آیا۔ گل نے کہا کہ اگر وہ چائے بنا دے تو اس کی بہت
مہربانی ہو گی۔ علی شیر مسکراتے ہوئے چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد چائے

ے آیا۔

کھڑکی کھلی تھی دُور دُور سے پہاڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ جن پہ چیل کے درخت اُگے تھے۔

گل جُو نے یوسف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"سی سال، ہی تو اس پہ تمنا گریسینٹ!"

یوسف شرما گیا۔

شیر افضل کہنے لگا "یوسف کہتا ہے اسے شاعری سے اور شاعروں سے نفرت ہے۔ سب شاعر خطرناک ہوتے ہیں۔

میں نے احتجاجاً کہا "یوسف! تمہیں مجھ سے تو کوئی شکایت نہ ہو گی"

یوسف نے ہنس کر کہا

"سب سے زیادہ شکایتیں تو تمہیں سے ہیں۔ تمہی تو کہا کرتے ہو" یوسف تمہارا چہرہ سنگِ مرمر کی طرح شفاف ہے۔ مجھ سے اپنی خوبصورتی کا خراج قبول کرو"

گل جو نے کہا "تو اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے۔"

شیر افضل نے درمیان میں کہا یوسف آدھی عورت اور آدھا مرد ہے۔

میں نے گل جو سے پوچھا کہ انگور کا رس کہاں ہے؟

وہ یکایک غمگین ہو گیا اور کہنے لگا" میں نے نوش کا راگ توڑ دیا ہے۔ اب میں انگور کے پانی سے شوق نہ کروں گا۔ آج میری محبتیں افسردہ ہیں۔ اور میں بے آرام ہوں۔"

یہ تغیر کچھ غیر منطقی تھا۔ میں نے وضاحت کے لیے پوچھا کہ ایسی یاس پسندی کی کیا وجہ ہے۔
گل جو نے کہا" میں خود بھی نہیں جانتا۔ میں مسکراہٹوں اور آنسوؤں کے درمیان زن کاٹتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر کوئی بیمار روح رہتی ہے۔ میں تمہارے سامنے بوڑھے نگ کا اسٹاک رجسٹر چیک کر رہا تھا مگر میں یہ سب کام کسی جچے تُلے نظام کے تحت کرتا ہوں۔ ایسا نظام جس پہ میری کوئی مرضی نہیں چل سکتی۔ مگر کبھی کبھی وہ بیمار روح مجھے کہتی ہے کہ جسم کو پھینک دے۔ ندیوں کو عبور کر اور کنواری برف پہ ہونٹ رکھ دے! مگر میرا جسم میری روح سے زیادہ طاقتور ہے۔ میری روح پھڑپھڑا جاتی ہے اور جسم سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا آپ زخمی کر لیتی ہے میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ مجھ سے دور دور چلی جاتی ہے۔ جیسے پہاڑ کی چوٹیاں جو مجھے دیکھ کر اپنا منہ دھند میں چھپا لیتی ہیں۔ میری بیماری کا کیا راز ہے؟"
میں نے کہا" یہ بیماری صرف تمہاری ہی نہیں اس دور کی مخصوص بیماری ہے۔ یہ تو نئے نظام کی پیدا ہوئی ہوئی بیماری ہے۔ اس نظام نے روحوں کو بیمار کر دیا ہے۔ اور

جسموں کی دیواریں مضبوط کردی ہیں۔ ہماری روحیں آزاد ہونا چاہتی ہیں مگر ہمارے جسم بھوک کی قید میں ہیں۔"

شیر افضل نے کہا کہ اب کی بار فصل خراب ہو رہی ہے۔ لوگ ناشپاتیاں جمع کر رہے ہیں۔

یوسف نے چماز مار کہ سگرٹ سلگایا۔ اور کہنے لگا "اس کا دھواں کتنا خوبصورت ہے۔"

گل جو نے کہا "اس دھوئیں میں خواب تیرتے ہیں۔ تمہاری آرزوئیں تیرتی ہیں۔ مگر میں شراب چھوڑ چکا ہوں۔ میری ہڈیوں میں دیمک لگ چکی ہے۔ میں گیت سننا چاہتا ہوں۔ مجھے گیت سناؤ۔ مجھے آسمانوں سے اترتے ہوئے زرد پتوں کے گیت سناؤ۔"

اسی کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں نے ایک نظم کا بند پڑھا۔

۵ رات پہ گرتے گئے زرد کرن کے آنسو
چاند بھی روتا رہا روتے رہے سائے
خامشی سنگ، غلط راہ کے صدمے کھائی
بید نے اک گیت کہا عمر کی بے چینی کا

میں نے جس دُکھ کو کہا ہے وہ خزاں کا ماتم
میں نے جو گیت کہے تیرے حزیں گیت کہے

. . . .

یہ کہا "زرد ہے مشرق میں بہت چاند کا رنگ
مرتسم کب سے ہیں پتوں پہ تیرے افسانے!
میری آواز ہے کم زور گراں باری سے
سالہا سال سے بیمار ہے کمزور زمیں . . ."

گل جو نے چلّا کر کہا "زمیں بھی میری طرح بیمار ہے۔ میری طرح کمزور ہے۔ جیسے میں اپنے جسم پر قابو نہیں پا سکتا اُسی طرح زمین بھی اپنی خزاؤں کو دُور نہیں کر سکتی۔ نہ خزاں جائے گی نہ زمین صحت یاب ہو گی۔ میں بیمار ہوں۔ زمین بیمار ہے۔ آسمان صحت یاب ہے۔ آؤ آسمان کی باتیں کریں . . ."

یوسف نے میرے کان میں کہا کہ گل جُو کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ شاید یہ شراب چھوڑنے کا اثر ہے۔ میں نے گل جُو کو جہاز مارکہ سگرٹ دیا۔ اور جب وہ کڑوا دھواں پینے لگا۔ اُس کے اعصاب آسودہ ہونے لگے۔ اور اُس نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔

"چو خود کردند راز خویشتن فاش - عراقی را چرا بدنام کردند ؟"

حمید نے ہنس کر پوچھا "عراقی کون ہے ؟"

اس نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "میں خود عراقی ہوں - اور ہندوستانی درویشوں کے ساتھ آیا ہوا خوبصورت لڑکا یوسف ہے - یہ ایران اور ہندوستان کی کہانی ہے - یہ حقیقت اور ظہور کی داستان ہے — مگر میں ایسی باتیں نہ کروں گا - یوسف مجھے تم سے محبت ہے - مگر میں بدصورت ہوں - میری روح بیمار ہے - میں زمین پر گرا ہوا اداس پتہ ہوں - مجھے روند کر گزر دو - مجھے نفرت سے دیکھ کر مسکرا دو - آسمان تمہارا ساتھ دے گا !"

شام کی تاریکی آہستہ آہستہ اتر رہی تھی - اور گل جو کی سسکیاں اکیلے تبریز کی ہوک بن رہی تھیں -

یوسف نے گل جو سے کہا "تمہارا میری دوستی پر شک کرنا مناسب نہیں"

اور گل جو نے ان آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا جو آرزوئیں کہتی ہیں - مگر انہیں بیان نہیں کرتیں ؟

. . . . . .

دن گزر رہے تھے اور فوجیوں کی نقل و حرکت روز بروز بڑھ رہی تھی - سب

طرف مورچے ہی مورچے تھے۔ اس اثنا میں میجر کرپا رام بدل کر راولاکوٹ چلا گیا۔ اس کی جگہ میجر پرتاپ سنگھ آیا تھا۔ باغ میں دو تین کمپنیاں اور آ گئی تھیں۔ خچروں کا کانوائے فوجیوں کے لیے برابر راشن اور کارتوس لاتا تھا۔ شام کے وقت بگل بجتا اور دن کے وقت ریوالی سنائی دیتی۔ ڈوگرہ حکومت کا جھنڈا ہر وقت لہراتا۔ اور فوجی ڈرل کرتے۔ بازار میں مارچ کرتے ہوئے گذرتے اور ڈوگری زبان میں گالیاں بھی دیتے!

ایک دن جب میں تحصیل کے دفتروں کے قریب سے گذر رہا تھا۔ اوور کوٹ پہنے ہوئے ایک شخص دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ کچھ فاصلے پر رک گیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور جب میں ناشپاتیوں کے جھنڈ میں پہنچا وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ میرے پاس آیا۔ اور دبے لفظوں میں کہنے لگا کہ کیا میں اس کے ساتھ کہیں جا سکتا ہوں؟ اُسے ایک خط لکھوانا ہے۔

ہم دونوں ناشپاتیوں کے جھنڈ سے ہوتے ہوئے بستی کے اُس بازار میں چلے گئے جہاں ایک بے ڈھنگ کی دکان چائے بیچتی تھی۔ اس دکان پر کوئی بورڈ نہ تھا۔ اور میں پہلے اس دکان پر کبھی آیا نہ تھا۔ دکان کا دروازہ دھوئیں سے کالا ہو چکا تھا۔ اندر دکان کی چھت بھی کالی تھی۔ اور دھوئیں سے کافی اندھیرا

چھایا ہُوا تھا۔ لکڑی کے بنچوں پہ چند لوگ ٹوپیاں اوڑھے بیٹھے تھے۔ دکان کا مالک کیتلی کو جوش دے رہا تھا۔ دکان کے اندر پردہ لٹکا ہُوا تھا جسے ہٹا کر میں اور وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئے +

دکان کے باہر توت کے درخت کے ساتھ سواری کا گھوڑا بندھا تھا۔ جو کبھی کبھی ہنہنا دیتا تھا +

اوور کوٹ والے شخص نے کہا کہ اُس کا نام عبدالخالق ہے۔ وہ مجھے سرور کی دکان پہ ملا تھا۔

اور مجھے اُس دن کی باتیں یاد آ گئیں۔

اُس نے کہا کہ وہ کچھ رقعے لکھوانا چاہتا ہے۔ آس پاس کے دیہاتوں کے نام۔ اُس نے کہا کچھ دنوں کے اندر باغ سے دو میل پرے بڑا وادی میں جلسہ ہو گا۔ جس میں لوگ جمع ہو کر مہاراجہ سے کہیں گے کہ وہ ریاست کی شمولیت کا فیصلہ جلد نہ کرے۔ اور کہ وہ پاکستان کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔

اس نے تیس کے قریب رقعے لکھوائے۔ اور گلزار خان کو آواز دی

ایک نوجوان لڑکا اندر آیا۔ عبدالخالق نے کہا کہ سواری کا گھوڑا باہر ہے۔

گلزار خان چلا گیا ـــــ

دکان کا مالک، اور کچھ دوسرے لوگ بھی کمرے میں آ گئے۔ اور باتیں ہونے لگیں۔
عبدالخالق کا کہنا تھا کہ باغ میں دس ہزار فوجی تھے۔ اور مزید کمک بھی آ رہی تھی۔
میں نے کہا کہ جلسوں سے تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیا یوں نہیں ہو سکتا کہ علاقے والے
باغ کو کسی طرح فتح کر لیں۔ آج کل راتیں بھی اندھیری ہیں۔ ٹیلیگراف کی تاریں علاقے
میں سے گزرتی ہیں وہ کاٹی جا سکتی ہیں۔ اور وائرلیس کا ایریل بھی گرایا جا
سکتا ہے۔

لوٹی اوڑھے ہوئے ایک نے کہا کہ وہ ابھی جا کر تاریں کاٹ دے گا مگر عبدالخالق نے
کہا کہ وہ وقت ابھی نہیں آیا۔

دوسرے دن میجر پرتاپ سنگھ نے باغ کے بازاروں میں فوجیوں کے پہرے لگا دئے۔
آتے جاتے لوگوں کی تلاشیاں ہونے لگیں۔ سکول کے چپڑاسی علی شیر نے کہا کہ فوجی
عبدالخالق کی تلاش کر رہے ہیں۔

میجر پرتاپ سنگھ نے اعلان کیا کہ جو شخص عبدالخالق کا پتہ دے گا۔ اُسے ایک ہزار
روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اُسی شام بستی میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ اور
مورچوں پر بندوقوں کی نالیاں دکھائی دینے لگیں۔

جس دن ہڈاواڑی میں جلسہ ہونا تھا۔ آسمان صاف تھا۔ اور دور دور تک آتے

جاتے ہوئے لوگ دکھائی دیتے تھے۔ میں سکول سے کچھ دور انجیر کے درخت سے ٹیک لگا
کر کھڑا تھا۔ مارسی گیبل سے آنے والی سڑک پہ خچریں اور خاکی وردیاں پہنے ہوئے سپاہیوں
کی نہ ختم ہونے والی قطاریں تھیں۔ خچریں اور سپاہی سب کے سب نقطے دکھائی دیتے
تھے۔ ان نقطوں کے آس پاس پہاڑی گھاس کا جسم پھیلا ہوا تھا۔ اور دونوں ندیاں
چاندی کی کیے پہنے ہوئے چندن ہار کی طرح چمک رہی تھیں۔۔۔ پہاڑیاں خموش تھیں۔
اور بستی کے آس پاس تحصیلدار، مقامی تھانے کے لوگ، اور فوج کے افسر گھوم رہے تھے۔
سب دکانیں بند تھیں۔

دفعتاً مجھ سے بہت دور۔ مارسی گیبل کی سڑک سے پرے، ندی کے چندن ہار کی دوسری
طرف نقطے ہی نقطے ابھرنے لگے۔ پتھروں اور چٹانوں کے درمیان نقطے، پانی اور پہاڑی
گھاس کے درمیان نقطے! ان کی آوازیں خواب میں گونجتی ہوئی آوازوں کے مانند مدھم
تھیں۔ جیسے خواب بلندیوں سے اُتر رہا ہو۔ ایک طرف سفید سی چیز دکھائی دے رہی تھی۔
کسی نے بتایا وہ جھنڈا ہے۔ اس کی سبزی پہاڑی گھاس کے باعث نظر نہیں آتی۔
میں نے کہا سبز رنگ گو پاکستان کا رنگ ہے حقیقت میں آزاد کشمیر کا رنگ ہے۔ یہ
رنگ پاکستان میں دکھائی دیتا ہے مگر آزاد کشمیر کے خون میں شامل ہے۔ اس لئے
پس منظر کی سبزی میں حل ہو جاتا ہے۔ جیسے محبتوں میں آرزو حل ہو جاتی ہے۔

جس شام ہڈاواڑی میں جلسہ ہوا ۔ میں بھی وہیں تھا۔ جلسہ گاہ کے ارد گرد لوگ تلواریں لئے پہرا دے رہے تھے۔ قیوم تقریر کر رہا تھا۔ اُس کی آواز میٹھی ہوتی تھی۔ اُس کا ایک فقرہ بار بار گونجتا تھا "آزادی اور غلامی کو صرف ۵ فٹ پانی کی لکیر جدا کرتی ہے۔ جہلم دریا کے اُس طرف آزادی اور صبح ہے، مگر اس طرف رات اور اندھیرے ہیں"

. . . .

دوسرے دن بعد دوپہر کو میں سویا ہوا تھا۔ دفعتاً ایسے ہوا جیسے چٹانیں ٹوٹ کر گر رہی ہوں۔ میں چونک اُٹھا۔ مورچوں پہ سے گولیاں برس رہی تھیں۔ اور اُن کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر گونج رہی تھی جیسے شیر غرا رہے ہوں۔

. . . .

گولیاں تیس گھنٹے متواتر برستی رہیں۔ تیس گھنٹوں میں نہ ایک بار سٹین گن رکی اور نہ ہی سپاہیوں کی رائفلیں خاموش ہوئیں۔ ہر مورچے سے بارود دھواں اور آگ بن کر نکلتا تھا۔ اور خوبصورت پہاڑیوں کا دل پھیلانے لگتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈوگرہ فوجی پہاڑوں اور درختوں سے جنگ کر رہے ہیں کیونکہ نہ ہی تو کوئی شخص دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی وہ کسی نشانے پہ گولیاں برسا رہے تھے۔ جب برستی ہوئی گولیوں نے انسانوں کو اپنے سامنے نہ پایا تو وہ بکریوں کے پیٹ

میں گھس گئیں۔ بکریاں مرگئیں۔ دودھ دینے والی گائیں مرگئیں، اور بھینسوں کے ہوانے چھلنی ہوگئے۔ کھلیانوں میں آگ لگ گئی۔ ادھر طرف

خاموشی نے اپنا ہاتھ پھیر دیا۔ درخت خوش ہوگئے۔ ندیاں غمگین ہوگئیں۔

جب گولیاں رکیں تو بازار میں کچھ دکانیں بھی کھلنے لگیں۔ مگر بازار سنسان تھے۔

جلنے کی دکانیں ویران تھیں۔ اور فوج کے سپاہی ان ویرانوں میں سنگینیں اٹھائے

پھرتے تھے؟

کہیں سے پولیس کے سپاہی ایک شخص کو پکڑ کر لائے۔ اس نے سفید اور اجلا کوٹ

پہنا ہوا تھا۔

ڈوگرہ سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا۔

کچھ فوجی اسے پیٹنے لگے جب گورنمنٹ جموں اینڈ کشمیر کے دیے ہوئے بید ٹوٹ

گئے تو انہوں نے کیل لگے ہوئے بوٹوں سے اسے ٹھوکریں لگائیں۔ جب وہ پکڑا

ہوا آیا تھا تو زمین پر کھڑا رہ سکتا تھا۔ مگر اب تو وہ زمین پر گر چکا تھا۔ اس کا

سفید کوٹ پھٹ چکا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

اور آخر وہ بے ہوش ہوگیا۔

مگر ڈوگرہ سپاہی اسے بدستور پیٹتے رہے!

کچھ آدمیوں کو گرفتار کر کے لایا گیا۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دی گئی، اور اس کے بعد انہیں پہاڑی کے نیچے پرانے جیل خانے میں بند کر کے گولی مار دی گئی۔

. . . .

اُسی شام گل جُو کا دماغ خراب ہو گیا۔ اُس نے دروازے کھول دیئے اور گھر کی عورتوں سے کہنے لگا "میری روح بیمار ہے۔ میں بیمار ہوں، مگر نہ تو میری روح آرام سے رہ سکتی ہے اور نہ ہی میں تندرست رہ سکتا ہوں۔ مجھے جانے دو، میں چشموں کے کنارے گیت سنوں گا۔ میں بنفشے کے پھول لاؤں گا اور ان سے ہم سب صبح کے ہار بنائیں گے۔ میں وہ ہار انار کے درختوں پہ رکھوں گا ——
مجھے بندوق دے دو، میں مرنا چاہتا ہوں، میں دائرے میں یہ گانا گاتا رہوں گا کہ پہاڑ خشک ہیں اور ندیاں غمگین ہیں . . . "

گھر کی عورتیں رونے لگیں اور فوج کے سپاہی اندر آ گئے۔

گل جُو بھاگ کر اندر کے کمرے میں گھس گیا۔ اور رونے لگا۔ سپاہیوں نے اُس کی طرف سنگینیں پھیر دیں۔ وہ زمین پہ گر گیا اور گڑگڑانے لگا۔

"میں نہ آزادی چاہتا ہوں اور نہ مجھے غلامی سے نفرت ہے۔ مجھے اگر موت ہی دینا ہے تو اُس پہاڑی سے دھکا دے دو جو چشموں کو اوپر سے جھانکتی ہے۔"

سپاہی اُسے پکڑ کر لے گئے۔ اور تیسرے دن اُسے چھوڑ دیا گیا۔

. . . .

اُسی شام میجر پرتاپ سنگھ نے بستی کے سب نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا

"ریاست کا فیصلہ سری نگر میں ہوگا۔ ہمیں امن وامان کی ضرورت ہے"

. . . .

مگر اُسی شام جو کمک آنا تھا وہ زندہ سپاہیوں کی بجائے زخمیوں کی کمک تھی۔ دو ہزار فوجیوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو زخمی نہ ہُوا ہو۔ ہاڑی گیل سے پرے جہاں سڑک جنگل میں سے گذرتی ہے اور نشیب میں ہے۔ اور جہاں دن کے وقت بھی اندھیرا رہتا ہے وہاں ان فوجیوں پہ ہر درخت اور ہر چٹان نے گولیاں برسائی تھیں۔ وہاں آگ کی بارش ہوئی تھی۔

کمپنی کمانڈر کا کہنا تھا حملہ کرنے والے دس بارہ ہزار سے کم نہ تھے۔ زخمی ہونے والے فوجیوں کا کہنا تھا کہ حملہ آوروں کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی تھیں اور بہت سے سپاہی صبح کا کھانا بھی نہیں کھا سکے تھے۔ اُن کا ہاضمہ بگڑ گیا تھا۔

شام ہوتے ہی فوجیوں پہ خوف وہراس چھا گیا۔ ہاڑی گیل کی طرف سے ایک روشنی بار بار

چمکتی تھی۔ اور باغ کے مغربی کونے پر سگنل موصول کیا جا رہا تھا۔ تاریخ میں دفعتاً معاملہ ختم ہو گیا۔ لالٹین کی روشنی میں پیغام پڑھنے والے فوجی نے کوڈ ایک طرف رکھ دی۔ ایک فوجی ہسپتال کے کیمپ سے معالجہ لانے کے لئے بھاگا۔ اندھیرے میں پھسلا اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں جا گرا۔ جب وہ کیمپ میں پہنچا کیمپ والوں نے سمجھا پٹھان بھیس بدل کر آ گیا ہے۔ انہوں نے اس پر گولی چلا دی۔ وہ زخمی ہو گیا۔

باغ ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ راہل اور مالوانی دو ندیاں اس کے دونوں طرف نشیب میں بہتی ہیں۔ ڈوگرہ سپاہیوں نے مغرب میں جہاں مورچے بنائے تھے وہ جگہ کھودی تھی اور مالوانی کے نشیب کے عین اوپر تھی۔ جھاڑیاں اس نشیب کو ڈھانکے ہوئے تھیں۔

پانچویں مورچے سے ایک شخص آیا۔ اور تیزی میں تیسرے مورچے کی طرف جانے لگا۔ گھبراہٹ میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ جھاڑیوں میں جا گرا۔ اس نے ایک درخت کا تنا پکڑ لیا۔

پاس کے مورچے پر سپاہی اندھیرے میں دم سادھے بیٹھا تھا۔ جب اس نے گہری گہری سانس سنی اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے زور سے کہا

"ہالٹ! کون گذرتا ہے"

آواز آئی "میں ہوں"۔ "میں نیچے گر رہا ہوں"۔

اُس نے احتیاط سے ٹارچ جلائی اور جھاڑیوں میں جھانکا اُس کا ساتھی لٹکا ہُوا تھا۔ اور بہت دُور نیچے نشیب میں ندی بہہ رہی تھی۔

بڑی مشکلوں سے اُسے نکالا گیا۔

- - - - - - - - - - - -

جب میجر پرتاپ سنگھ نے کہا کہ امن و امان ضروری ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا تھا کہ بستی کے لوگ فوجیوں کے ساتھ پہرا دیں۔ میں جس کے ساتھ پہرا دے رہا تھا وہ جموں کا سنتری تھا۔ اُس کی دو بہنیں ابھی کنواری تھیں اور ماں بیوہ تھی۔ یہ مورچہ پتھروں کی بنی ہوئی ایک کوٹھری میں تھا جس کی ایک دیوار گر چکی تھی۔

جب رات زیادہ ہوگئی تو کہیں سے کتوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔

"یہ کون رو رہا ہے؟" سنتری نے برین گن پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"کتے رو رہے ہیں"

"ہوں"

کتوں کے رونے کی آواز تیز ہو گئی۔ میں نے کہا
"سنتری! معلوم ہے کتے کیوں روتے ہیں؟"
اس نے سر کے اشارے سے پوچھا کیوں؟
"جس رات کوئی مرنے والا ہو کتے اس کی موت کا ماتم کرتے ہیں"!
سنتری چپ ہو گیا
دور اندھیرے میں ایک سایہ بڑھا۔ اور درخت کے پاس رک گیا
سنتری نے برین گن کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔
میں نے کہا "اس جھونپڑی میں ایک بوڑھا اور اس کی بیٹی رہتے تھے۔"
خموشی
"بوڑھے کو سانپ ڈس گیا۔ اور بیٹی گلے میں رسی ڈال کر مر گئی"
خموشی
"سنتری!" میں نے کہا
"کیا ہے؟" وہ بولا
"جہاں تم بیٹھے ہو وہیں وہ لڑکی مری تھی۔"
سایہ درخت سے الگ ہو گیا

کوٹھری کے باہر زور سے دھماکا ہوا۔ اور ایسے محسوس ہوا جیسے سایہ بھاگ کر جھونپڑی کی طرف آ رہا ہو۔

سنتری نے زور سے کہا "ہالٹ، کون گذرتا ہے؟"

اور اس کے ساتھ ہی ایک کتا ٹوٹی ہوئی دیوار پر سے کودا اور سنتری کے ساتھ ٹکرا گیا۔ سنتری کی پیٹھ اس طرف تھی۔ اس نے گھبرا کر برین گن چلا دی!

مگر چند ہی لمحوں میں وہ خود بے ہوش ہو چکا تھا۔